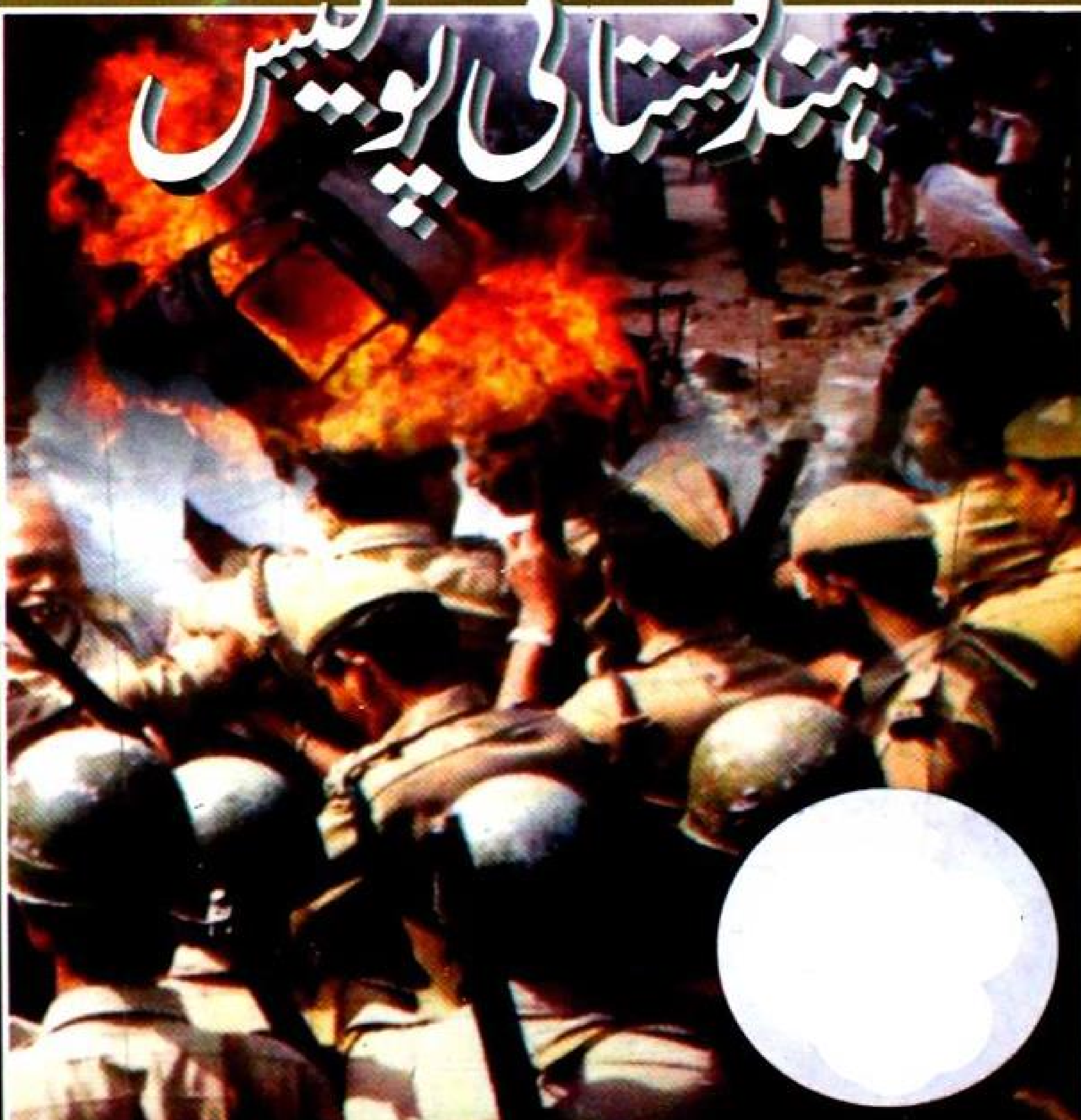
فرقہ وارانہ فسادات
اور
ہندوستانی پولیس



وبھوتی نارائن رائے

فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس

وبھوتی نارائن رائے

فرقہ وارانہ فسادات
اور
ہندوستانی پولیس

وبھوتی نارائن رائے

ناشر

خبردار پبلی کیشنز

Z-103، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی - 110 031

نام کتاب : فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس
مصنف : وبھوتی نارائن رائے
طباعت : ایم کے آفسیٹ پرنٹرز، 1397، چوڑی والان، دہلی-6
اشاعت : 2008 (دوم)
قیمت : -/100 روپے

ملنے کے پتے:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی
کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی
انجم بک ڈپو، 466- مٹیا محل اسٹریٹ، جامع مسجد، دہلی
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

FIRQA WARANA FASADAAT AUR HINDUSTANI POLICE

2008
Rs. 100/-

By : VIBHUTI NARAIN RAI

KHABARDAAR PUBLICATIONS
Z-103, Taj Enclave, Geeta Colony, Delhi - 110031
Telefax : (011)22412891, Email : khabardaar@yahoo.com

فہرست

مبصرین کی رائے

○ فرقہ وارانہ فسادات کو انتظامیہ کی ایک بڑی ناکامی کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ موجودہ دور میں اس موضوع کی وسیع پیانے پر افہام و تفہیم میں اعلیٰ پولیس آفیسر اور معروف ادیب وبھوتی نارائن رائے کا یہ تحقیقی مطالعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ رائے صاحب نے یہ مطالعہ نیشنل پولیس اکادمی، حیدر آباد کے لیے ایک سال کی سخت محنت اور لگن کے بعد مکمل کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کے بعض نتائج کو چھپانے اور دبانے کی کوشش بھی کی گئی۔ اس کو منظر عام پر لانے کا سہرا نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن، مسوری کے سر ہے، جس نے اسے سب سے پہلے شائع کیا۔ میری پُر زور سفارش ہے کہ انتظامیہ اور پولیس کے تمام افسران کے لیے اس کتاب کا پڑھنا پڑھانا لازمی کر دیا جانا چاہیے۔

پدم روشا

ڈائریکٹر جنرل آف پولیس (ریٹائرڈ)

○ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کے رویے پر یہ ایک ٹھوس، حتمی اور مستند تحقیق ہے۔ مصنف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ پولیس میں کام کرنے والے لوگ اسی سماج سے آتے ہیں جس میں فرقہ پرستی کے جراثیم پلتے ہیں، ان میں وہ سب تعصبات، نفرت، شکوک اور خوف موجود ہوتے ہیں جو ان کا فرقہ کسی دوسرے فرقے کے بارے میں رکھتا ہے۔ پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد بھی وہ خود کو اپنے مذہب والوں کے 'ہم' میں شامل رکھتے ہیں اور دوسرے فرقے کو 'وہ' مانتے رہتے ہیں۔

اے جی نورانی

("فرنٹ لائن" میں)

○ وزارتِ داخلہ اور پولیس بیورو آف ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ نیز اپنے سروے سے حاصل شدہ اعداد و شمار کے تفصیلی جائزے پر مشتمل یہ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ ہر فساد کے 80 فیصد شکار مسلمان ہوتے ہیں اور جو لوگ گرفتار کیے جاتے ہیں، ان میں بھی تقریباً 90 فیصد اقلیت ہی کے افراد ہوتے ہیں۔ مسٹر رائے کے مطابق "یہ استدلال کے خلاف ہے کہ اگر 80 فیصد شکار مسلمان ہیں تو ہونا یہ چاہیے کہ گرفتار لوگوں میں 70 فیصد ہندو ہوں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔"

سیبل چٹرجی

("آؤٹ لک" میں)

عرضِ ناشر

ڈاکٹر وبھوتی نارائن رائے کی زیرِ نظر کتاب فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس کی جانب داریوں کو اُجاگر کرنے والی ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کتاب میں جہاں ایک طرف ملک میں فرقہ واریت کے فروغ اور اس کے عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے، وہیں دوسری طرف اس کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ثقافتی محرکات کا بھی بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع اور تحقیق کے اعتبار سے یہ کتاب ایک ایسی انوکھی اور جرأت مندانہ پیشکش ہے، جسے تاریخ میں ہمیشہ نمایاں جگہ ملے گی۔ تحقیق کے دوران جس غیر جانبداری، حقیقت پسندی اور دیانتداری کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اس کے لیے صاحب کتاب کو داد دی جانی چاہئے۔ ایک حساس اور نازک موضوع پر لکھتے وقت ڈاکٹر رائے نے ہر قسم کے دباؤ سے خود کو آزاد رکھا ہے اور موضوع سے وابستہ تمام پہلوؤں پر بے باکی سے بحث کی ہے، جو ان کے وسیع النظر انسان ہونے کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر رائے از خود ایک آئی پی ایس آفیسر ہیں اور اتر پردیش کے کئی حساس اضلاع میں بطور ایس ایس پی تعینات رہ چکے ہیں، جہاں انہیں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کے کردار کو سمجھنے میں خاصی مدد ملی ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے کہ خود ایک اعلیٰ پولیس آفیسر نے اپنے محکمے کی پیشہ ورانہ خامیوں اور جانبداریوں پر جرأت سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ...... "ہندوستان میں اکثر فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اقلیتوں کے خلاف پولیس کا رویہ جانبدارانہ ہوتا ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ پولیس امن و قانون کا ایک غیر جانبدار وسیلہ بننے کے بجائے سماجی ادارے کی حیثیت سے ہندو مسلم تعلقات میں از خود ایک بااثر فریق بن گئی ہے"۔

گجرات کے حالیہ فسادات میں ایک بار پھر پولیس کی جانبداریوں کی بے شمار داستانیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اس واقعہ کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ گجرات کے نرودہ پاٹیہ علاقے میں فساد کا شکار ہونے والی ایک عورت اپنے تین ماہ کے بچے کے ساتھ جان بچانے کے لیے دربدر بھٹک رہی تھی، اس دوران جب اس نے ایک پولیس کانسٹبل سے بھاگنے کے لیے محفوظ راستہ معلوم کیا تو اسے ایک ایسا راستہ بتا دیا گیا جہاں پہلے سے ہی فسادیوں کی بھیڑ موجود تھی۔ اس جنونی بھیڑ نے اس عورت کو اس کے تین ماہ کے شیرخوار بچے سمیت مٹی کا تیل چھڑک کر

زندہ جلاڈالا۔ ("ٹائمز آف انڈیا" نئی دہلی 20 مارچ 2002)

ڈاکٹر وبھوتی نارائن رائے نے جو اس وقت اتر پردیش میں وِجلینس محکمے کے انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہیں، گجرات کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "گودھرا میں جو کچھ بھی ہوا وہ قابل مذمت ہے، لیکن احمد آباد میں پولیس کی بے عملی دیکھ کر میرا یہ یقین پختہ ہو گیا ہے کہ پولیس اقلیتوں کے خلاف فسادات کو ہوا دینے کا کام کرتی ہے اور فسادیوں کے ساتھ پولیس کو بھی اقلیتی فرقے کے لوگ دشمن نظر آتے ہیں۔"

اگرچہ زیر نظر کتاب کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس کے کردار کا مطالعہ ہے لیکن اس کتاب میں فرقہ وارانہ فسادات کے نفسیاتی اور سماجی محرکات کا مطالعہ بھی اتنی گہرائی اور حقیقت پسندی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ بعض جگہ اسے پڑھتے وقت روزمرہ کی زندگی پر بنی کسی فلم کو دیکھنے کا احساس ہوتا ہے اور سب چیزیں اپنے گردوپیش میں وقوع پذیر ہوتی نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر رائے نے اس کتاب میں وزارت داخلہ کی رپورٹوں، تحقیقاتی کمیشنوں اور مستند پولیس ریکارڈوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ "آزادی کے بعد تقریباً سبھی فسادات میں استثنیٰ کو چھوڑ کر ہلاک ہونے والوں میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ فسادات کے دوران اور اس کے بعد کی پولیس کارروائی بھی خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف ہی کی جاتی ہے۔ ان فسادات میں بھی جہاں صرف مسلمان ہلاک ہوئے، پولیس نے گرفتاریاں بھی خاص طور پر انہی لوگوں کی کیں، تلاشیاں بھی بیشتر انہی کے گھروں کی ہوئیں اور کرفیو کا ستم بھی انہی کو سہنا پڑا۔"

ڈاکٹر وبھوتی نارائن رائے کی یہ کتاب دراصل ایک تحقیقی مقالہ ہے، جسے 1998ء میں "COMBATING COMMUNAL CONFLICTS" کے عنوان سے انگریزی میں شائع کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رائے کی خواہش پر اس کا اُردو ترجمہ آپ کے پیش نظر ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اس کی اشاعت کا بار ڈاکٹر رائے نے میرے کاندھوں پر ڈالا۔ اس کتاب کے ترجمے، ترتیب اور تدوین میں ہر ممکن احتیاط برتی گئی ہے، تاہم اگر آپ کو کہیں کوئی نقص نظر آئے تو ضرور مطلع کیجئے گا۔ اس کتاب کے ذریعہ روزنامہ "خبردار جدید" اپنے ایک اشاعتی ادارے کی بنیاد بھی ڈال رہا ہے۔

معصوم مرادآبادی

ایڈیٹر "خبردار جدید" دہلی

دیباچہ

فرقہ وارانہ فسادات کا سامنا کرنے میں ہندوستانی پولیس جس ڈگر پر چلتی رہی ہے اس کا ریکارڈ انتہائی ناقص ہے۔ تقریباً ہر ایک سنگین فساد کے بعد پولیس پر نہ صرف نااہلی اور پیشہ وارانہ فرض ناشناسی کے الزامات' بلکہ یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ اس کے طرز عمل سے شدید فرقہ وارانہ تعصب جھلکتا ہے۔ اقلیتوں کے خلاف تعصب سے کام لینے اور انھیں تحفظ فراہم کرنے میں کوتاہی کے الزامات کسی ایک ریاست کی پولیس پر نہیں بلکہ بالعموم ہندوستان کی پوری پولیس فورس پر لگائے جاتے ہیں۔ اقلیتوں میں پولیس والا "دشمن" تصور کیا جاتا ہے۔ ہر ایک بڑے فساد کے تحقیقاتی کمیشن' غیر جانب دار مشاہدین' اخبارات' حقوق انسانی کی علمبردار تنظیموں' عدلیہ اور اقلیتی فرقوں کے نمائندوں کی طرف سے پولیس پر اقلیتوں کے خلاف مظالم اور کھلم کھلا بے عملی اختیار کرکے تشدد برپا کرنے میں اکثریتی فرقہ کی حوصلہ افزائی کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ پولیس اس کے جواب میں ہمیشہ مفاد پرستوں پر اس کی ذمہ داری ڈال دیتی ہے اور ادھوری اطلاعات کو اس کا سبب گردانتی ہے۔ اس طرح وہ الزامات کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے' لیکن سچائی کو کب تک دبایا جائے گا اور بنیادی سچائیوں کو کب تک نظر انداز کیا جائے گا؟ حقائق سے آخر کب تک انکار کیا جائے گا؟

جب مجھے ایس۔ وی۔ پی۔ نیشنل پولیس اکیڈمی حیدر آباد کے ایک ساتھی کی حیثیت سے یہ جائزہ لینے کا موقع ملا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ہندوستان کی

پولیس کا طرز عمل کیا ہوتا ہے' تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کام اتنا دلچسپ اور مشکل ہوگا۔ میں جتنا زیادہ گہرائی میں گیا اتنا ہی زیادہ مجھے اپنی مشکلات کا علم ہوا۔ مجھے سب سے بڑی مشکل ایک عام پولیس والے کی ذہنیت پر قابو پانے میں محسوس ہوئی۔ مجھے جن پولیس افسروں اور دیگر دوسرے پولیس والوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا اُن سب کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے خلاف سخت اقدامات کرنا ہی فرقہ وارانہ فساد کی روک تھام کا سب سے مؤثر طریقہ ہے۔ چند کو چھوڑ کر تقریباً سبھی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ فساد شروع کرنے کے ذمہ دار مسلمان ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ سختی سے پیش آنا ہی روک تھام کا سب سے کارگر طریقہ ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ہاشم پورہ' میرٹھ (1987ء)' یالوگائیں' بھاگلپور (1989ء) جیسے واقعات ذرا بھی احساس ندامت نہ پیدا کر سکے۔ ہاشم پورہ میں پولیس نے 30 بے قصور مسلمانوں کو مار ڈالا اور بھاگلپور میں پولیس کے اشارے سے اکثریتی فرقہ کے لوگوں نے اقلیتی فرقہ کے 100 افراد کو ذبح کر ڈالا۔ اسی ذہنیت کی وجہ سے مجھے بہت سی ایسی پولیس دستاویزات تک رسائی حاصل نہ ہو سکی' جن سے تحقیقی جائزے میں مدد ملتی۔

عام طور پر ایک سے زیادہ مذہب والے سماجوں میں مختلف عقائد کے لوگوں کے درمیان تشدد کوئی غیر معمولی بات نہیں مانی جانی چاہئے۔ لیکن اس تشدد سے نپٹنے والی پولیس کے لیے ضرور یہ کام ایک طرح سے "اگنی پریکشا" کی طرح ہوتا ہے۔ اسباب بہت واضح ہیں۔ فسادات سے نپٹنے والا پولیس عملہ لڑنے والے فرقوں میں سے کسی ایک فرقے کے افراد پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ کسی جانبداری کے بغیر خالص پیشہ وارانہ طریقوں سے فرقہ وارانہ فسادات کو کچلنا اور متصادم فرقوں کا اعتماد حاصل کرنا ان کے لیے بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ اس کے لیے پولیس فورس کو اپنی تربیت' طریقہ انتخاب' آلات اور رویوں میں خاطر خواہ تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ جو پولیس فورسز حسب ضرورت تبدیلی کر پاتی ہیں وہ کامیابی کے ساتھ اس چیلنج کا سامنا کر سکتی ہیں۔

انگلینڈ اور امریکہ کی پولیس فورس اس کی مثال ہیں' جنھوں نے اپنے ملکوں میں

نسلی تشدد سے نپٹنے کے لیے مؤثر حکمت عملی بنائی اور نسلی اقلیتوں کو پولیس میں زیادہ نمائندگی دے کر نیز تربیت اور طریقہ کار میں بنیادی تبدیلی لاکر افروایشیائی نسل کے اپنے شہریوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اس کے برعکس دوسری مثالیں جنوبی ایشیاء کی پولیس فورسز ہیں، جن کے رویوں اور کارکردگی سے ان ملکوں کی اقلیتیں اکثر ان کے تئیں عدم اعتماد اور غصے کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان ہر جگہ ایک جیسی ہی کہانی دہرائی جاتی ہے۔

ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے مجھے کئی فرقہ وارانہ فسادات کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میرے لیے ہمیشہ پولیس والوں کا رویہ سب سے زیادہ تکلیف کا باعث رہا ہے۔ ہر مرتبہ یہی محسوس ہوا کہ پولیس والے ایک خاص قسم کے تعصب اور اقلیت مخالف ذہنیت کے تحت کام کرتے ہیں۔ لازمی طور پر اس میں ان کی ناقص تربیت کا ہاتھ تو ہوتا ہی ہے، پولیس فورسز میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی کا فقدان بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ ملک کے تقریباً تمام بڑے فسادات کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا یہ یقین پختہ ہوا ہے کہ پولیس فورسز میں عملے کی تعداد، ہتھیار، گاڑیاں، مواصلاتی آلات جیسے ''لاجسٹکس'' میں اضافہ کرنے سے زیادہ اہم ان کی سوچ میں تبدیلی لانا ہے۔ ایک بڑی اور مسلح پولیس فورس قوت ارادی اور سیکولر طرز عمل کے بغیر ویسا ہی مظاہرہ کرے گی جیسا ہم نے 6/دسمبر 1992ء کو دیکھا، جب 20 ہزار سے زیادہ پولیس والوں کے سامنے بابری مسجد توڑ دی گئی اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہے۔

اس ایک سال کے تجربے سے میرا یہ یقین اور پختہ ہوا ہے کہ اگر ہندوستانی سماج کو ایک سرگرم، ترقی یافتہ، حقیقت پسند اور سیکولر اکائی کے طور پر زندہ رہنا ہے تو اسے مذہبی کٹھ ملاپن، غیر سائنسی سوچ اور ذہنی جمود سے اوپر اٹھنا ہوگا۔ اس پورے عمل میں ہندوستانی پولیس بھی ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے، بشرطیکہ وہ خود کو بدلے اور ملک کے سبھی طبقوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

ایک پولیس افسر کی حیثیت سے میرا یہ پختہ یقین ہے کہ جب تک ہم یہ حقیقت

تسلیم نہ کریں کہ فرقہ وارانہ فساد سے نمٹنے میں ہم سنگین غلطیاں کرتے رہے ہیں' اس وقت تک یہ غلطیاں بار بار کرتے رہیں گے اور برابر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے رہیں گے۔ بد قسمتی سے پولیس قیادت یہ غلطیاں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی سبب سے ایس۔وی۔پی۔ نیشنل پولیس اکیڈمی نے اس بارے میں میری تحقیقاتی رپورٹ شائع کرنے سے انکار کر دیا' حالانکہ اسی اکیڈمی نے مجھے تحقیقاتی جائزہ کے لیے فیلوشپ دی تھی' البتہ میں ایل بی ایس نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن' مسوری کا شکر گذار ہوں کہ اس ادارے نے میری تحقیقاتی رپورٹ کو شائع کرنے میں پہلا قدم اٹھایا۔ خصوصاً میں ایل بی ایس نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن' مسوری کے ڈائریکٹر جناب این سی سکسینہ (آئی۔اے۔ایس) کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے میری مرتب کردہ رپورٹ کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔

– وبھوتی نارائن رائے

باب اوّل

تحقیقی جائزہ اور اس کی ضرورت

عہد جدید کے تناظر میں دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے کثیر النوع سماج کے لیے فرقہ واریت سب سے بڑا خطرہ ہے۔اس سے ہمارے آئین کے بنیادی ڈھانچے کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہندوستان نے سیکولر جمہوریت کی راہ اختیار کی ہے' لیکن گذشتہ دہائیوں کے دوران ہمارے سیکولر نظام کو مسلسل خطرہ لاحق رہا ہے۔اگر ہندوستانی سماج کو فرقہ پرستی میں رنگ دینے کا بڑھتا ہوا سلسلہ مؤثر طور سے روکا نہ گیا اور یہ لعنت فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں عملی طور پر برابر جاری رہی' تو ایک انصاف پسند سیکولر اور ترقی پسند ہندوستان وجود میں لانے کی وہ اصل عمارت ہی چکنا چور ہو جائے گی' جس کا خواب ہمارے لیڈروں نے دیکھا تھا۔

فرقہ پرستی کسی فرقہ کی اجارہ داری یا میراث نہیں ہے اور سبھی بڑے اور چھوٹے مذہبی فرقے اس سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ تاہم ہندو اور مسلمان دونوں کے علاقائی اثرات کے پیش نظر آج کے حالات میں ہندوستانی فرقہ پرستی کا طول و عرض جاننے کے لیے دونوں فرقوں کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُسی وجہ سے تمام ہندو اور مسلمان یا ان کی اکثریت فرقہ پرست ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی

جگہ قائم ہے کہ فرقہ پرستوں کے جذبات اور خیالات کا اثر ہندو اور مسلمانوں کی اجتماعی سوچ پر پڑتا ہے اور یہی اجتماعی سوچ دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں استعمال ہوتی ہے۔

ہندوستانی سماج میں فرقہ پرستی کا سب سے بدنما اظہار وہ تشدد ہے جس کا دھماکہ وقفہ وقفہ کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے تحقیقاتی جائزہ کے مقصد میں فرقہ وارانہ تشدد سے وہ تشدد مراد ہے جو کسی ایک فرد یا افراد کے خلاف اس کی فرقہ وارانہ شناخت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اکثر واقعات میں کسی کو ہدف اس یقین کی بناء پر بنایا جاتا ہے کہ ایک مذہبی فرقہ اپنے مفادات کو دوسرے مذہبی فرقہ کے مفادات کو نقصان پہنچا کر ہی تحفظ اور فروغ دے سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ فرقہ وارانہ تشدد جسمانی نوعیت کا ہی ہو۔ بہت سے واقعات میں یہ تشدد جسمانی سے زیادہ نفسیاتی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ پاکستان جیسے مذہبی ملک میں اقلیتوں کو بہت سے حقوق سے محروم رکھا گیا ہے اور وہ محض دوسرے درجہ کے شہریوں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہاں جسمانی طور پر تشدد کے واقعات کم ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں اقلیتوں کو روزمرہ زندگی میں جس ذلت اور محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ جسمانی تشدد سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کچھ فرقے تہوار منانے کے لیے اپنی غذائی عادتیں اور پہناوا بدل ڈالتے ہیں محض اس لیے کہ دوسرے فرقوں کے تشدد آمیز ردعمل سے بچ سکیں۔ اکثر صورتوں میں غذا اور لباس کی یہ تبدیلی رضاکارانہ معلوم ہوتی ہے لیکن اندر اندر مزاحمت کا رجحان اور اپنی شناخت گم ہونے کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ یہ بھی جسمانی تشدد کی ایک شکل ہوتی ہے جس کی نفسیاتی رگڑ متاثرہ فرقہ کو محسوس ہوتی ہے اور بعد میں جسمانی تشدد کا سبب ہو سکتی ہے۔

ضروری نہیں کہ فرقہ وارانہ ذہنیت سے متاثر سبھی لوگ فسادات میں حصہ لیں' بلکہ فسادات میں شریک ہونے والوں' فسادات بھڑکانے والوں اور فسادیوں کے ہمدردوں کے اپنے اپنے مفادات اور اسباب یا مصلحتیں ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے فسادی ذہنیت کے افراد اپنی شرکت کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فساد میں حصہ لینے سے ان کے نصب العین کے حصول میں مدد ملے گی جیسے "ہندو راشٹر' دارالحرب یا خالصتان" کے مقصد کو تقویت ملے گی۔

پولیس ریاست کی ہو یا مرکز کی' سب سے پہلے اسی کو فرقہ وارانہ فسادات سے سابقہ

پڑتا ہے۔ فسادات کے تینوں مرحلوں...... ''تشدد بھڑکانے' تشدد بھڑک اٹھنے اور پھر متاثرین کی باز آبادکاری'' میں اسی کو سرگرم ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ نظم ونسق برقرار رکھنا ریاستی ذمہ داری ہے اس لیے فسادات کو دبانے کے لیے سب سے پہلے ریاستی پولیس کو تعینات کیا جاتا ہے۔ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقامی پولیس فرقہ وارانہ فساد پر قابو نہیں پاسکتی تو مرکزی پولیس فورس جیسے سی آر پی ایف 'بی ایس ایف 'انڈو تبتن بارڈر پولیس یا فوج کو طلب کرلیا جاتا ہے تاکہ مقامی پولیس کو اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں مدد دی جائے۔

چونکہ پولیس میں اسی سماج سے لوگ بھرتی کئے جاتے ہیں جہاں فرقہ وارانہ بغض وعناد کا وائرس پرورش پاتا ہے اس لیے وہ اپنے ساتھ دوسرے فرقہ کے تئیں وہی تعصب' شکوک وشبہات اور نفرت بھی لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ پولیس میں شامل ہونے کے بعد بھی اپنے ہم مذہبوں (ہندوؤں) کو ''ہم'' اور دوسرے فرقہ (اقلیت) کو ''وہ'' کہتے رہتے ہیں۔ (''ہم'' ہندو اور ''وہ'' مسلمان)۔

توقع یہ کی جاتی ہے کہ پولیس میں بھرتی ہونے والے لوگ ایک مشترکہ سیکولر شناخت اختیار کرلیں گے لیکن تجربہ سے یہی ثابت ہوا ہے کہ ان میں سے اکثر اپنی ''ہندو'' یا ''مسلم'' شناخت برقرار رکھتے ہیں اور خاکی وردی میں ملبوس وہ پہلے ہندو اور مسلم اور بعد میں پولیس والے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہندو اور مسلمان کی یہ جداگانہ شناخت باقی رہنے سے فرقہ وارانہ فساد میں پولیس کا کردار متاثر ہوتا ہے۔ اگرچہ اکثر سرکاری تحقیقات میں پولیس کو مسلمانوں کے خلاف جانب دارانہ رویہ اختیار کرنے کے الزامات سے بری کردیا جاتا ہے' لیکن دیگر تحقیقات سے ظاہر ہوا ہے کہ پولیس ایسی غیر جانبدار اور انصاف پسند نہیں ہوتی جیسا سرکاری اداروں کی تحقیقاتی دستاویزات میں بتایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اکثر فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اقلیتوں کے خلاف پولیس کا رویہ جانب دارانہ ہوتا ہے۔ اس غیر منصفانہ طرزِ عمل کا سب سے بڑا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ پولیس کے افسروں اور سپاہیوں میں ہندوؤں کا غلبہ ہوتا ہے' جنھیں سماجی اثرات کے دھارے سے محفوظ رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ پولیس لاء اینڈ آرڈر کا ایک غیر جانب دار وسیلہ بننے کے بجائے ایک سماجی ادارہ کی حیثیت سے ہندو مسلم تعلقات میں ایک تیسرا بااثر فریق بن گئی ہے۔ مختلف فرقہ وارانہ فسادات اور پولیس تنظیموں کے کردار کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

(اے) پولیس میں اقلیتوں کی نمائندگی ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے کم ہے۔ بی پی آر اینڈ ڈی کی ایک تحقیق (رپورٹ) سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ ریاستوں میں، جو فرقہ وارانہ طور پر حساس سمجھی جاتی ہیں، پولیس میں اقلیتوں کا تناسب 5 فیصد سے بھی کم ہے۔ جیسے مدھیہ پردیش میں 2ء4 فیصد۔ مہاراشٹر میں 2ء4 فیصد اور یو۔پی میں 9ء 4 فیصد ہے۔

(بی) پولیس والے سماج سے تعصب یا خوف واندیشے (حقیقی یا خیالی) اپنے دلوں میں لئے ہوئے اپنی تنظیموں میں شامل ہوتے ہیں۔

(سی) اکثر فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس کا رویہ منصفانہ اور غیر جانب دارانہ نہیں رہا (دسمبر 1992ء میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد یا جنوری 1993ء میں بمبئی میں ہونے والے واقعات ایسی واضح مثالیں ہیں، جب پولیس نے ایک ہی جیسے دو فسادات میں مختلف طریقۂ کار اپنایا۔)

(ڈی) پولیس کے بارے میں اکثریتی اور اقلیتی افراد کا تصور ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مسلمان پولیس کو اپنا "دشمن" سمجھتے ہیں۔ اکثر فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں اقلیتوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ریاستی (مقامی) پولیس کی بجائے فوج یا نیم فوجی دستے تعینات کئے جائیں۔ ایسے بہت سے واقعات ہوئے ہیں کہ فرقہ وارانہ جھگڑا پولیس اور مسلمانوں کے درمیان تصادم کی شکل اختیار کر گیا۔

مسئلہ کی تشریح

یہ مسئلہ ان نقطوں میں بیان کیا گیا:

"فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کی غیر جانب داری کے بارے میں سماج کے مختلف طبقوں کا مختلف ادراک"۔

تحقیقات کے اغراض ومقاصد

تحقیقات کے اغراض ومقاصد یہ ہیں:

(اے) فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں پولیس کی غیر جانب داری کے ادراک (تصور) کی تشریح کرنا۔

(بی) فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں:

(i) تشدد پر قابو پانے کے لیے طاقت کے استعمال کے حوالہ سے پولیس کے طرزِ عمل کی تحقیقات کرنا۔

(ii) فرقہ وارانہ فساد کے حقائق کی رپورٹنگ، تفتیش اور مقدمات چلانے میں فرقہ وارانہ جانب داری۔

(iii) گرفتار شدہ افراد کے ساتھ پولیس حراست میں سلوک۔

(iv) احتیاطی اقدامات میں امتیازی رویہ۔

(سی) مندرجہ ذیل امور کے متعلق پولیس کی غیر جانب داری کا جو تصور پایا جاتا ہے اس کی تحقیقات کرنا:

(i) فساد سے متاثرہ اقلیتی فرقہ کے لوگ۔

(ii) فساد سے متاثرہ اکثریتی فرقہ کے لوگ۔

(iii) پولیس کے اہل کار۔

(ڈی) ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرنا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کی فرقہ وارانہ جانب داری کی جانچ کی جاسکے۔

(ای) ایک ایسا تربیتی پروگرام وضع کرنا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کی جانب داری سے نمٹا جاسکے۔

تحقیقات کا پلان اور طریق کار

(1) مندرجہ ذیل فسادات کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا۔ یہ فسادات بڑے پیمانے پر

ہوئے اور پولیس کی غیر جانب داری کی تحقیقات کے لیے اہم سمجھے جاتے ہیں' تاکہ آئندہ فرقہ وارانہ فسادات کی پیش بندی اور ان پر قابو پانے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

1۔ کانپور کا فساد	1931
2۔ رانچی کا فساد	1967ء
3۔ احمد آباد کا فساد	1969ء
4۔ بھیونڈی اور جلگاؤں کے فسادات	1970ء
5۔ بنارس کا فساد	1977ء
6۔ جمشید پور (بہار) کا فساد	1979ء
7۔ میرٹھ کا فساد	1990ء
8۔ بھاگلپور کا فساد	1989ء
9۔ ایودھیا کے واقعات	1992ء
10۔ بمبئی کا فساد	1992-93ء

یہ تحقیقات دو مرحلہ میں کی گئیں :

سب سے پہلے ہر ایک فرقہ وارانہ فساد کے فوری اور دیرینہ پس منظر پر تفصیلی بیانیہ ازسر نو ترتیب دیا گیا۔ جیسے فساد کے بڑھنے (زور پکڑنے) کے واقعات کی ترتیب اور اسے دبانے کے لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کوششیں۔

مختلف فسادات کی ازسرنو تفصیل مرتب کرنے کی غرض سے متعدد تحقیقاتی کمیشنوں کی رپورٹوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ مآخذ (Source Material) کے لیے محکمہ آثارِ قدیمہ (نیشنل آرکائیوز' نئی دہلی) اور اسٹیٹ آرکائیوز آف یوپی اور بہار جیسے دستاویزی مرکزوں سے مدد لی گئی۔ ان ذریعوں اور صحافتی ذرائع سے جو اطلاعات جمع کی گئیں ان کی تکمیل کے لیے ذاتی انٹرویو لئے گئے۔

دوسرے مرحلہ میں اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کے متاثرین اور ریٹائرڈ اور برسرِ ملازمت پولیس اہل کاروں کے تفصیلی انٹرویو لئے گئے۔ فسادات کے متاثرین ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انٹرویو کے لیے پولیس اہل کاران میں سے چنے گئے' جنھیں فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹنے میں کافی واسطہ پڑا تھا۔ انٹرویو دینے والوں میں سے ہر ایک زمرہ کے افراد

کے لیے علیحدہ سوال نامے تیار کیے گئے۔

مختلف ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کا تجزیہ کرنے کے لیے ایک بین شعبہ جاتی اندازِ فکر برقرار رکھا گیا۔ مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ ملازمین کی صداقت یا راست بازی کی جانچ کی جائے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے نفسیاتی اور سماجی محرکات کی گہرائی تک پہنچا جائے اور انھیں پولیس والوں کے رویہّ کے طرز اور نمونہ سے جوڑا جائے اور فرقہ وارانہ فساد کے حالات میں پولیس کی غیر جانب داری کے تصور کی چھان بین کی جائے۔

حقائق فراہم کرنے کے ذرائع

حقائق اور اعداد و شمار جمع کرنے میں مندرجہ ذیل ذرائع اور تکنیکوں سے کام لیا گیا۔

(اے) دستاویزات

(i) تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹیں۔

(ii) اخبارات کے تراشے / رپورٹیں۔

(iii) انسانی حقوق کے کارکنوں کی رپورٹیں۔

(iv) نیشنل آرکائیوز اور مختلف ریاستوں کے آثارِ قدیمہ میں موجود مواد۔

(بی) ڈائریکٹر جنرل، انسپکٹر جنرل، ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدوں پر فائز افسروں کے مرتب شدہ انٹرویو۔

(سی) اُن ماتحت پولیس افسروں کے ساتھ مرتب شدہ انٹرویو جنھیں فساد پر قابو پانے پر کافی عبور حاصل رہا تھا۔

(ڈی) فساد کے دوران پولیس کی غیر جانب داری سے متعلق سماج کے مختلف طبقوں کے خیالات جاننے کے لیے سوال نامہ۔

نمونہ

تحقیقاتی جائزے کا نمونہ حسب ذیل ہے:

نمبر شمار	زمرہ	تعداد
1۔	پولیس افسران	50
2۔	اقلیتی طبقے کے فساد متاثرین	200
3۔	اکثریتی طبقے کے فساد متاثرین	200

تحقیقاتی جائزہ کی حدود

(1) یہ تحقیقات فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس کی غیر جانب داری کے مفہوم کو سمجھنے پر مرکوز تھی۔

(2) یہ تحقیقات صرف ہندو اور مسلمان کے درمیان جھگڑوں تک محدود تھی۔

(3) تحقیقاتی مشاہدات صرف ان دس بڑے فسادات پر مبنی ہیں جو 1931ء اور 1993ء کے درمیان ہوئے۔

اہم اصطلاحوں کی تشریح

(1) **پولیس کی غیر جانب داری کا مفہوم** : عام طور پر اس اصطلاح کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ قانون نافذ کرنے میں غیر جانب دارانہ یا ایک جیسا سلوک کیا جائے۔

(2) **فرقہ وارانہ فسادات** : فرقہ وارانہ فسادات کا مطلب وہ فسادات ہیں جو ہندو مسلمانوں کے درمیان ہوں۔ جن میں دونوں ایک دوسرے سے لڑیں اور مذہب کی بنیاد پر جھگڑے کے فریق بن جائیں۔

بسا اوقات ریاست (حکومت) اور شہریوں کے کسی گروہ کے درمیان جھگڑا ہو جاتا ہے۔ یہ گروہ کوئی بھی مذہبی گروہ ہوسکتا ہے لیکن یہ تصادم فرقہ وارانہ فساد کی تعریف میں نہیں آتا۔

(3) **سماج کے طبقات** : سماج کے مختلف طبقات جن کی شناخت کا تعین ایک مشترک مذہب سے ان کی وابستگی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ OO

باب دوئم

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات
تاریخی پس منظر

فرقہ پرستی کی تعریف پروفیسر بپن چندرا کے مطابق یہ ہے کہ "یہ وہ عقیدہ ہے جس کے تحت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک خاص گروہ کے لوگ ایک مذہب کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے سماجی 'سیاسی اور معاشی مفادات بھی ایک جیسے یا مشترکہ ہونے چاہئیں۔ یہ ایک مسلمہ نظریہ مانا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو 'مسلمان 'سکھ یا عیسائی جداگانہ فرقے ہیں جن کی ساخت آزادانہ اور الگ الگ ہے اور وہ اسی بنیاد پر منظم ہوتے ہیں"۔ نیز یہ کہ ایک مذہب کے پیروکار کے نہ صرف مذہبی مفادات بلکہ سیکولر مفادات بھی مشترک ہیں یعنی ان کے سیاسی اور ثقافتی مفادات مشترک ہیں۔ اس کا منطقی مفہوم یہ ہے کہ نہ صرف ایک مذہبی فرقے کے مفادات مشترک ہیں 'بلکہ لازمی طور پر یہ مفادات دوسرے فرقوں کے مفادات کے خلاف ہیں۔

فرقہ پرستی کی مذکورہ بالا تعریف کی نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

1- اس سے کثیر طبقاتی وجود کی نفی ہوتی ہے۔ ہندوستان جیسے سماج میں جہاں بہت سی

علاقائی جداگانہ شناختیں موجود ہیں۔ زبان' غذائی عادات' لباس یا طرح طرح کی علاقائی اقتصادی نابرابری کے باوجود ایک خاص مذہبی فرقہ کی ایک مشترک شناخت اور مشترک مفادات ہیں۔

(2) فرقہ پرستی کو ہمیشہ ایک دشمن کی ضرورت ہوتی ہے یعنی دوسرے فرقے کے افراد کی...... ایک فرقے کے افراد کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کے مفادات...... سیکولر یا روحانی...... صرف دوسرے فرقوں کے مفادات کو نقصان پہنچا کر ہی محفوظ کیے جا سکتے ہیں۔ فرقہ واریت کے نظریے سے متاثر لوگ یہ مان کر چلتے ہیں کہ ان کے سماجی' اقتصادی مفادات ایک فرقہ کے افراد کی حیثیت سے محفوظ کیے جا سکتے ہیں۔

(3) معنوی اعتبار سے فرقہ وارانہ شناخت کی تشریح یہ ہے کہ سکھوں' ہندوؤں اور مسلمانوں کے طور پر شناخت کیے گئے گروہوں کے مفادات باہمی طور پر ٹکراتے اور الگ الگ ہیں۔

ہندوستانی تناظر میں فرقہ پرستی کا مطلب بنیادی طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وسیع پیمانہ پر شکوک و شبہات' خوف' رقابت' انتقامی ذہنیت کے جذبات اور تشدد موجود ہیں۔ اس تحقیقی مطالعہ کا مطلب نہ تو یہ ہے کہ فرقہ پرستی کی تشریح اصطلاحی معنوں میں کی جائے' یا یہ کہ ان سماجی' سیاسی' اقتصادی یا ثقافتی محرکات کا تجزیہ کیا جائے جن سے فرقہ پرستی کو تقویت ملتی ہے۔ اس لیے ہم یہاں اپنے آپ کو فرقہ پرستی کے سب سے اہم مظاہر یعنی فرقہ وارانہ فسادات تک محدود رکھیں گے۔ قدرتی طور پر فسادات کے جائزے سے ہمیں بار بار ان اسباب پر غور کرنے میں مدد ملے گی' جو ہندوستانی سماج کو فرقہ پرستی کا رنگ دینے میں کار فرما ہیں۔ یعنی وہ طاقتیں جو اسے بڑھانے اور شہری زندگی پر اس کے مضر اثرات پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ اس لیے ہم اپنے آپ کو ہندو مسلم جھگڑوں تک محدود رکھیں گے۔ ہندو سکھ' ہندو عیسائی اور ہندو سماج کے اندرونی جھگڑے' جو حال میں ابھر کر سامنے آئے ہیں' ہماری تحقیقات کے لیے برمحل نہیں ہیں۔ اس لیے ان کا حوالہ محض اتفاقی ہو گا۔

فسادات کرانے میں سامراجیت کا کردار

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات خاص طور سے برطانیہ کی اس پالیسی کا نتیجہ رہے

ہیں کہ ہندوستانی قومی تحریک کو اندرونی جھگڑوں میں ڈبو دیا جائے اور ہر ایک جائز و ناجائز طریقے سے اپنی حکومت قائم رکھی جائے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ قومی تحریک کے ہر ایک مرحلہ میں جس میں ہندو اور مسلمانوں نے ایک ساتھ حصہ لیا' فرقہ وارانہ تشدد میں نمایاں کمی نظر آئی۔ جب تک مشترکہ جدوجہد تیز رہی اور ہندو مسلمان کندھے سے کندھا ملا کر سامراج کے خلاف جدوجہد کرتے رہے فرقہ وارانہ فسادات مکمل طور پر رک گئے۔ لیکن جب قومی تحریک ناکام ہو کر ختم ہو گئی یا لیڈروں نے اسے واپس لے لیا تو حوصلہ ہارے ہوئے عوام برطانیہ کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کا شکار ہو گئے اور اپنے غیر ملکی حاکم کے خلاف لڑنے کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ الجھ پڑے۔ ہندوستانی قومی تحریک کے تین اہم مرحلے اس صورت حال کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

1857-58ء کی پہلی جنگ آزادی کے دوران ہندو اور مسلمان فوجیوں نے انگریز افسروں کے خلاف بغاوت کی اور بے مثال ہندو مسلم اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ فرقہ وارانہ فسادات انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئے۔ پہلی جنگ آزادی 1857-58ء سے پہلے بنارس میں (1809ء)' کیوبل (1820ء)' مراد آباد' سنبھل 'کاشی پور (1833ء)' شاہجہاں پور (1837ء)' بریلی 'کانپور' الہ آباد میں (1837ء تا 1852ء)' ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں' جو آج کے معنوں میں فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ لیکن 1857ء اور 1858ء دو ایسے سال رہے جن میں ایک بھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔

پہلی جنگ آزادی کے موقع پر جو ہندو مسلم اتحاد ہوا اس کے بارے میں برطانوی سامراج کے رویہ کو سمجھنے کے لیے 1853ء اور 1855ء کے درمیان ہونے والے واقعات پر نظر ڈالنا بہتر ہو گا۔ 1853ء میں امیٹھی کے صوفی بزرگ بندگی میاں کے خلیفہ مولوی امیر علی کو لکھنؤ میں خبر ملی کہ اجودھیا میں بابری مسجد کو تباہ کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ پر بیراگی فرقہ قابض ہو گیا ہے۔ مولوی امیر علی نے اودھ کے نواب واجد علی شاہ سے لکھنؤ میں ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ جب نواب سے ملنے کے لیے ان کی کوششیں بے سود ہوئیں تو انھوں نے لکھنؤ سے ہی جہاد کا نعرہ بلند کر دیا۔ تب واجد علی شاہ نے پریشان ہو کر اس معاملے کو پُرامن طریقے سے طے کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ بابری مسجد کی جگہ پر جبری قبضہ اُن کے احکام کے باوجود ختم نہیں کیا گیا' مگر لکھنؤ میں خبر پہنچی کہ مسجد کو منہدم نہیں کیا گیا تھا۔ اسی دوران

مولوی امیر علی لکھنؤ سے امیٹھی واپس آگئے اور مسلمانوں کی ایک مسلح تنظیم جہاد کے نام سے تیار کی۔ نواب واجد علی شاہ نے مداخلت کی اور عوام سے اپیل کی کہ وہ مذہبی تنازعہ حل کرنے کے لیے طاقت کا استعمال نہ کریں اور مسجد مسلمانوں کو واپس کر دی جائے۔[1]

نواب شجاع الدولہ کی اہلیہ بہو بیگم اور برطانوی ریزیڈنٹ کے درمیان 1816ء میں یہ معاہدہ طے پایا کہ اجودھیا میں امن وامان برقرار رکھنا ایسٹ انڈیا کمپنی کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے واجد علی شاہ نے برطانیہ سے اپیل کی کہ مولوی امیر علی کو ضبط وتحمل سے کام لینے پر آمادہ کیا جائے۔[2] لیکن برطانیہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ انکار فوجی نااہلیت کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس کے پس پردہ ایک خوب سوچی سمجھی ہوئی حکمت عملی تھی۔ جو اس مقصد سے تیار کی گئی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مختلف نزاعی امور کو ابھارا جائے تاکہ انھیں متحد ہونے نہ دیا جائے اور غلامی کی زنجیریں کاٹ دینے سے روکا جائے۔ اس کے بعد واجد علی شاہ نے اپنی فوج بھیجی اور ایک طویل اور سخت لڑائی کے بعد مولوی امیر علی کو شجاع گنج بازار (حیات نگر) کے پاس ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد 1855ء میں سرکردہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اجودھیا میں تصفیہ کر لیا۔

1857ء اور 1858ء میں اودھ میں آزادی کی جدوجہد نمودار ہوئی اس کا سب سے زیادہ شاندار باب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد تھا۔ جب یہ تحریک ناکام ہو کر ختم ہو گئی تو برطانیہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کے لیے سوچی سمجھی ہوئی تدبیریں اختیار کیں اور بابری مسجد۔رام جنم بھومی تنازعہ کے حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتائج بالکل ظاہر ہیں۔ یہ جھگڑا نہ صرف 19ویں صدی میں، بلکہ آج تک موجود ہے۔

1857-58ء کے بعد 1919-20ء میں عوام نے تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ تحریکیں رولٹ ایکٹ اور جلیان والا باغ کے قتل عام کے خلاف اور ترکی کی خلافت کے مسئلے پر شروع کی گئی تھیں۔ ایک بار پھر ہندو۔مسلم اتحاد کا بے مثال نظارہ دکھائی دیا۔ اُس دوران 1858ء اور 1919ء کی درمیانی مدت میں سنگین فسادات ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ فسادات ایسے مقامات پر ہوئے، جہاں پہلے کبھی کوئی ہندو۔مسلم فساد نہیں

---

1. نیو یلی ڈسٹرکٹ گزیٹر آف بار، بارہ بنکی صفحہ - 169
2. ایضاً صفحہ - 170

ہوا تھا۔ نقصانات اور دوررس نتائج کے اعتبار سے یہ فسادات خاص طور سے ذہن میں رکھنے کے لائق ہیں: بریلی (1871ء)' مئو (1893ء)' بمبئی (1893ء)' ناسک (1894ء)' مشرقی بنگال (1907ء)' پشاور (1910ء) 'اجودھیا (1912ء)' آگرہ (1913ء)' شاہ آباد (1917ء) اور کرتار پور (1918ء)۔

لیکن 1919ء اور 1920ء کے سال بڑے نمایاں طور پر فسادات سے محفوظ رہے۔ ایسا کیوں ہوا کہ ماضی کے برسوں کے فسادات یکایک رک گئے؟ اس سوال کا جواب 1857ء اور 1858ء کے اسباب کی عدم موجودگی میں ملے گا۔

تحریک خلافت، پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر عالم اسلام میں ترکی خلیفہ کا اقتدار ختم ہونے اور خلافت عثمانیہ کے زوال کے نتیجہ میں شروع ہوئی۔ اس تحریک میں زیادہ تر مسلم مذہبی شدت پسندوں کا ہاتھ تھا۔ انھوں نے اس حقیقت سے بالکل ہی نظر ہٹالی کہ ترکی خلیفہ، جن کی گم شدہ خلافت کو یہ بحال کرنے کے آرزومند تھے، خود اپنے ملک ترکی میں ظلم وناانصافی کی علامت بن گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی مصطفیٰ کمال اتاترک اور ان کے زیر قیادت قوم پرست طاقتوں نے خلیفہ کا عہدہ اور دستور ختم کیا' ترک عوام نے اس کا خیر مقدم کیا اور جب ایسا ہوا تو ہندوستان جیسے ملکوں میں شدت پسندوں کے زیر قیادت خلافت کی تحریک اپنی موت آپ مرگئی۔

اس حقیقت کے باوجود کہ تحریک خلافت اپنے اصل کے اعتبار سے فرقہ وارانہ تھی' اس سے ہندو۔مسلم اتحاد میں مدد ملی۔ یہ اتحاد اگرچہ عارضی ثابت ہوا لیکن تحریک آزادی میں، ایک شاندار باب کا اضافہ بنا۔ مہاتما گاندھی جیسے لیڈروں نے اس تحریک کے توسط سے ہندو۔مسلم اتحاد قائم کرنے کا ایک سنہری موقع پایا اور انھوں نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔

کانگریس نے اس تحریک میں شرکت کے ساتھ ہی پورے ملک میں تحریک عدم تعاون شروع کردی۔ ان دونوں تحریکوں کا یکساں طریق کار حکومت کے ساتھ عدم تعاون تھا۔ الٰہ آباد میں خلافت کمیٹی کے اجلاس مورخہ 9/اپریل 1919ء کے اجلاس کی قرارداد اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی قرارداد عدم تعاون میں عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ حکومت کی ملازمتوں سے استعفے دیں' سرکاری اعزازات اور خطابات واپس کریں اور ٹیکس ادا نہ کریں۔

1919ء اور 1920ء کی تحریک کی سب سے اہم خصوصیت ہندو۔مسلم بھائی چارہ تھا۔

ہندوؤں نے کھانے پینے میں مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات ترک کر دی اور جو کچھ مسلمان دیتے اسے قبول کر لیتے۔ مسلمانوں نے ہندو لیڈروں کو مسجدوں میں بلا بلا کر تقریریں کرائیں۔ گاندھی اور سروجنی نائیڈو نے بمبئی میں مسجد میں خطاب کیا اور سوامی شردھانند نے دہلی کی جامع مسجد میں تقریر کی۔ مسلمانوں نے ہڑتالوں اور ستیہ گرہ میں ہندوؤں کا ساتھ دیا اور حکومت کے لاٹھی چارج، گولیوں، قید و بند اور جائیداد واملاک کے نقصانات کا سامنا کیا۔ پنجاب میں ستیہ پال اور سیف الدین کچلو دونوں امرتسر کے لیڈر تھے۔ گاندھی اور محمد علی جوہر نے مشترکہ طور پر قومی تحریک چلائی۔

ہندو۔مسلم اتحاد اور دونوں کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں ملک کے اندر فرقہ وارانہ فسادات میں نمایاں کمی آئی اور 1919ء اور 1920ء میں ایک بھی فرقہ وارانہ فساد کسی جگہ نہیں ہوا۔ 1920ء میں کیرالا میں موپلا بغاوت ہوئی، جو نہ صرف یہ کہ غیر انسانی استحصال پر مبنی اقتصادی تعلقات کا نتیجہ تھی، بلکہ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خلافت جیسی قدامت پسند تحریک کی کمزور بنیاد پر ہندو۔مسلم اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ کوشش اگرچہ نیک نیتی کے ساتھ کی گئی لیکن بنیادی طور پر یہ کمزور تھی۔ موپلا بغاوت کے جائزے سے یہ جاننے میں مدد ملتی ہے کہ بنیاد پرست طاقتیں فرقہ وارانہ صف آرائی میں نفرت پیدا کرنے کے لیے معاشی جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اس پر ہم اسی باب کے آخر میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ لیکن ملگاؤں (1921ء) اور ملتان (1922ء) کے دو معمولی واقعات کو چھوڑ کر تحریک عدم تعاون کی یہ مدت فرقہ وارانہ فسادات سے محفوظ رہی۔

5/ فروری 1922ء کو گورکھپور میں چوری چورا پولیس تھانہ کو آگ لگا دی گئی اور اس کے اندر تمام پولیس والے ہلاک ہو گئے تو گاندھی جی نے یہ کہہ کر عدم تعاون کی تحریک واپس لے لی کہ اس میں تشدد ہونے لگا تھا۔ عدم تعاون کی تحریک اچانک واپس لئے جانے سے اس میں شریک سرگرم لوگ بے دم اور بے سہارا رہ گئے اور ان کے پاس کوئی دوسرا عملی خاکہ نہیں رہا۔ اچانک واپس لینے سے یہ شکست خوردہ تحریک جس کی اب کوئی سمت نہ رہی تھی، ایک بار پھر "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی سامراجی پالیسی کا شکار ہو گئی۔ شدھی اور تبلیغ کی تحریکوں نے عوام کی کثیر تعداد کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ان سب کے نتائج صاف ظاہر ہیں۔ 1943ء میں پندرہ بیس مقامات پر فسادات ہوئے، جن میں امرتسر، لاہور اور سہارنپور کے فسادات خاص

طور سے شدید تھے۔

سیول نافرمانی کی تحریک کے دوران ایک اہم واقعہ یہ تھا کہ پشاور میں فوج نے ہجوم پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ فوج گڑھوالی ہندوؤں پر مشتمل تھی' جبکہ تحریک میں حصہ لینے والوں میں اکثر مسلمان پٹھان تھے۔ اس قسم کا اتحاد صرف ایسی ہی تحریکوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جب یہ تحریک مارچ 1931ء میں واپس لے لی گئی تو وہی صورت حال پیدا ہو گئی' جو ہم 1858ء میں غدر کی ناکامی کے وقت یا 1922ء میں عدم تعاون کی تحریک واپس لئے جانے کے بعد دیکھ چکے ہیں۔ ملک ایک بار پھر فرقہ پرست طاقتوں کی گرفت میں آ گیا۔ 1931ء میں ہی آگرہ' بنارس' مرزاپور اور کانپور میں فسادات ہوئے۔ کانپور کا فساد کئی اعتبار سے خاص طور سے سنگین تھا۔ صوبہ جات متحدہ یا آج کے اتر پردیش (یوپی) میں یہ پہلا بڑا فساد تھا۔ اس میں نہ صرف گنیش ودیارتھی جیسے محب وطن کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا' بلکہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 400 سے زیادہ افراد مارے گئے۔ 1200 سے زیادہ زخمی ہوئے' 18 مسجدیں اور 42 مندر تباہ کئے گئے۔ ہندوؤں کے 248' اور مسلمانوں کے 101 گھر جلا دیے گئے۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی واضح قومی تحریک میں عوام کی شرکت سے فرقہ وارانہ طاقتوں پر روک لگائی جاسکتی ہے۔ ہمیں یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ مذکورہ بالا مدتیں مختصر تھیں اور ان تحریکوں کو یا تو برطانیہ نے کچل دیا یا لیڈروں نے واپس لے لیا۔ اس لیے ان کا اثر بھی بالکل عارضی ثابت ہوا۔

اس لئے یہ نتیجہ نکالنا سراسر غلط ہو گا کہ مذکورہ تینوں مدتوں (58-1857' 22-1920ء اور 1930ء) میں ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے فرقہ پرستوں کو کچل دیا گیا۔ یہ دونوں فرقہ پرست عناصر ان تمام برسوں میں حکومت کی مدد اور حمایت سے پروپیگنڈے میں سرگرم رہے۔ خاص طور پر 1920ء اور 1930ء کے دوران ہندو اور مسلم فرقہ پرستی کو فروغ حاصل ہوا۔ لیکن قومی تحریکوں میں عوام کی بھاری اکثریت کی شرکت کے باعث فرقہ پرست طاقتوں کو اپنی سرگرمیوں کے لیے کافی تعداد میں رضاکار نہ مل سکے اور وہ فرقہ وارانہ فسادات نہ کرا سکے۔ اسی لئے ان مدتوں میں فرقہ وارانہ فسادات نظر نہیں آتے۔ اگر ہندو۔مسلم اتحاد قائم کرنے کی کوشش معاشی' سیاسی اور سماجی موضوعات پر مرکوز کی جاتی اور عوام کو اس میں بھرپور طریقہ پر شریک کیا جاتا اور تحریک خلافت اور گئورکھشا جیسی تحریکوں میں عوام کو متحد کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو نتیجہ

اس سے مختلف ہوتا۔

مذہبی جھگڑوں اور فرقہ وارانہ فسادات میں فرق

یہ دلیل ایک خطرناک خوش فہمی میں مبتلا کرسکتی ہے کہ فرقہ پرستی اور اس کی تباہ کن شکل یعنی فرقہ وارانہ فسادات برطانوی سامراج کی پیداوار ہیں۔ یہ کہنا کہاں تک سچ ہے کہ جدید معنوں میں فرقہ پرستی ہندوستان میں برطانیہ کی سیاسی اور فوجی طاقت مستحکم ہو جانے کے بعد نمودار ہوئی۔ جبکہ دونوں فرقوں میں مذہبی جھگڑے کے بیج پہلے سے موجود تھے؟ از منہ وسطیٰ تاریخ کے وہ ہندو۔ مسلم جھگڑے، جن میں مسلمان اور ہندو، مذہب یا دیگر موضوعات پر متصادم ہوتے تھے، فرقہ پرستی پیدا کرنے میں کہاں تک ذمہ دار ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی ہندوؤں کے مختلف فرقوں (برہمن، بودھ، شیوائی اور ویشنوئی) میں جھگڑوں کے اسباب موجود تھے؟ خوش فہمی سے بچنے کے لیے مندرجہ ذیل میں سے کچھ سوالوں کا جواب دینا ضروری ہے۔ چونکہ یہ تحقیقی مطالعہ بنیادی طور پر فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق ہے اس لیے ان سوالوں کا جائزہ اسی تناظر میں لیا جائے گا۔

فرقہ وارانہ فسادات کرانے میں سامراجیت کے کردار کو محدود کرنے کے حق میں دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی دلیل کے مطابق فسادات کو برطانیہ کی طرف منسوب کرنا غلط ہے کیونکہ فسادات انگریزوں کی آمد سے پہلے بھی ہوتے تھے اور یہ فسادات ہندوستانی زندگی کی ایک مستقل خصوصیت تھے۔ دوسری دلیل کے مطابق اگر فرقہ وارانہ فسادات سامراج کی دین ہیں تو انگریز کے چلے جانے کے بعد یہ ختم ہو جانے چاہئے تھے۔ لیکن برطانیہ کے رخصت ہونے کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور زیادہ تسلسل کے ساتھ ہونے لگے اور ان میں تشدد مزید بڑھ گیا۔

پہلی دلیل کو زوردار بنانے کے لیے برطانوی سرکاری ریکارڈ اور کرسٹو فربیلی جیسے مورخوں نے کچھ ثبوت فراہم کئے ہیں۔ 1907ء کے بنارس گزیٹیر میں 1809ء اور اس کے بعد کے سال میں امن عامہ میں خلل ڈالنے کا پہلا واقعہ ہوا اور شہر کو ایسے ہی جھگڑے کا سامنا کرنا پڑا، جیسے ماضی میں سماج کے ہندو۔ مسلم فرقوں میں مذہبی بغض و عناد کی وجہ سے متواتر

ہوا کرتے تھے[1]۔ گزیٹیر میں کسی اور جھگڑے کی مثال پیش نہیں کی گئی اور یہ کام کرسٹو فر بیلی جیسے موٴرخوں پر چھوڑ دیا گیا۔

اپنی کتاب "تاریخ سے قبل فرقہ وارانہ-مذہبی جھگڑا ہندوستان میں 1700-1860ء تک" میں بیلی نے فرقہ وارانہ فسادات کے تسلسل کا یہ نظریہ پیش کیا ہے: ہندوستان میں فرقہ وارانہ جھڑپوں کی روایت برطانوی اقتدار کے استحکام سے بھی پہلے سے چلی آرہی ہے۔ انھوں نے کئی واقعات کا ذکر کیا ہے' جو نوآبادیاتی نظام کے دوران ہونے والے فسادات سے ملتے جلتے ہیں۔ بیلی نے سترہویں صدی میں مسلم جاگیرداروں کے خلاف سکھ' ہندو کاشتکاروں کی بغاوت کا ذکر کیا ہے اور ان کا تقابل 1920ء کے مشرقی یوپی کے فسادات اور 1930-40ء کے مشرقی بنگال کے فسادات سے کیا ہے۔ اگر ہم بیلی کی بیان کی ہوئی مثالوں کو فرقہ وارانہ فساد کی عام اور مسلمہ تعریفوں میں سے کسی بھی ایک تعریف کی کسوٹی پر پرکھیں تو وہ اس پر پوری نہیں اتریں گی۔ اس سے ایک اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے' اور وہ یہ کہ بعض اوقات تعصب کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے علمی تحقیق اور کاوش سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ بیلی نے جو مثالیں بیان کی ہیں ان میں سے کوئی بھی فرقہ وارانہ فسادات کی گونج نہیں' بلکہ اُن مختلف اقتصادی' سیاسی اور سماجی رقابتوں اور کوششوں کی صدائے بازگشت ہے' جو کسی بھی کثیر مذہبی اور کثیر طبقاتی سماج میں موجود ہوتی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ جھگڑے اور اختلافات تھے نہ کہ فرقہ وارانہ فسادات۔ یہاں ہم ان دونوں کے درمیان فرق بیان کریں گے۔

مذہبی جھگڑے عالم آخرت سے متعلق مذہبی عقائد کے اختلافات کا اظہار ہوتے ہیں۔ ہر ایک مذہب اپنے ماننے والوں کو یہی بتاتا ہے کہ خدا' اس کے پیغمبر' ایشور کے اوتاروں اور مقدس کتابوں کی اسی کی تعبیر و تشریح سب سے بہتر اور قطعی ہے۔ ہر ایک مذہب کا دعویٰ ہے کہ اس کی کتابیں مقدس ہیں۔ سب ہی مذاہب اپنے ماننے والوں کو داخلی جمہوریت سے محروم رکھتے ہیں اور اختلاف رائے سے منع کرتے ہیں۔ اپنے مذہبی عقائد پر ایمان و یقین اور یہ احساس کہ ان پر یقین نہ رکھنے والے گمراہ لوگ ہیں اور انھیں راہِ راست پر لانے کی ضرورت ہے' وہ جھگڑے پیدا کرتا ہے' جنھیں مذہبی لڑائیاں کہا جاسکتا ہے۔ برطانیہ کی آمد سے پہلے کے جھگڑے اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ اس طرح معمول کے مطابق دیگر مذاہب والوں کی عبادت

---

[1] بنارس کا ڈسٹرکٹ گزیٹر (1907) صفحہ 207 اور 208

گاہوں کو مسمار کرنااور رضامندی یازبردستی کے ساتھ مذہب قبول کرانا ایک دینی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی ایک مذہب کے ماننے والے حکمراں کی ریاست میں یہ کام امور مملکت کے دیگر غیر مذہبی کاموں کے ساتھ ساتھ حکومت کے فرائض میں شامل سمجھے جاتے اور غیر مذہبی امور مملکت میں امن وامان برقرار رکھنااور ٹیکسوں کی وصولی شامل ہوتی۔ دوسرے یعنی غیر مذہبی امور مملکت کی لازمی اہمیت نے مسلم حکمرانوں کو اپنی حکومت میں اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں پر ہندوؤں کو تعینات کرنے پر مجبور کیا۔ بنیادی طور پر یہ اپنے وجود کے تحفظ کی ضرورت کا احساس ہی تھا۔ جس کے باعث مسلم حکمرانوں نے گئوکشی جیسے رواج پر پابندی لگائی۔ بابر نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹے ہمایوں کو نصیحت کی تھی کہ آئندہ ہونے والے شہنشاہ کو اپنی ہندو رعایا کو خوش رکھنا چاہئے۔ بابر کی یہ مشہور نصیحت اپنے وجود کے تحفظ کی ضرورت کے احساس کی ایک اور مثال ہے۔

سیاسی اداروں کو جمہوریت نمابنانے اور سرکاری ملازمتوں کی شکل میں نئی راہیں کھلنے سے ہندو، مسلمانوں کے تعلقات میں ایک نئی کشمکش یا مسابقاتی دور شروع ہوا۔ نو آبادیاتی نظام کے دوران 19ویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہونے والے میونسپل انتخابات کے موقع پر ہندوستانی سماج میں یہ ظاہر ہوا کہ تلوار نہیں بلکہ سروں کی گنتی اقتدار میں شرکت کی بنیاد ہے۔ اس سے فرقہ وارانہ خطوط پر میدان ہموار کئے جانے میں مدد ملی۔ سرکاری کام کاج میں انگریزی کو ذریعہ استعمال بنادیا گیا۔ اس نے بھی مسلمانوں کو ایسے حالات سے دوچار کردیا جہاں وہ ہندوؤں سے مات کھا گئے، کیونکہ ہندوؤں کو مغربی طرز تعلیم اختیار کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ ان دو محرکات سے دونوں فرقوں میں جھگڑوں کے نئے اسباب پیدا ہوگئے۔ یہ دنیاداری کے جھگڑے تھے کہ منتخب اداروں میں کسے کتنی نمائندگی ملے اور عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں کارروائی اور ترجمہ کون سی زبان میں ہو۔ برطانوی سامراج کی پُرزور حمایت سے فرقہ وارانہ تنظیموں نے اپنے ہم مذہبوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی کہ ان کے مسائل دوسرے مذہب کے لوگوں کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور ان مسائل کا حل بھی ان کے مذہب میں پوشیدہ ہے۔ دونوں فرقوں (ہندو، مسلمان) کے درمیان وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہونے کا یہ ایک بنیادی سبب تھا۔

مذہبی اور فرقہ وارانہ جھگڑوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فساد میں شہری آبادی ملوث

ہوتی ہے۔ مسلم حکومت کے دوران جھگڑا عام طور پر حکومت اور شہری ہندو آبادی میں ہوا کرتا تھا۔ ریاست یا حکومت ہندو عبادت گاہوں کو مسمار کر دیتی' جزیہ جیسے ٹیکس لگا دیتی یا تبدیلیٔ مذہب کی حوصلہ افزائی کرتی۔ لیکن ایک ساتھ رہنے والے ہندو مسلمانوں پر اس کا کچھ اثر نہ پڑتا اور ان کے باہمی تعلقات بدستور خوشگوار رہتے۔ ریاست کی چونکہ اپنی مسلح فوج تھی۔ اس لیے اسے سماج کے دوسرے فرقہ کو نقصان پہنچانے کے لیے تشدد پر آمادہ مسلح ہجوم کو مشغول کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ریاست کی شخصی حکومت کے جواز کو بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن برطانوی دور حکومت میں ہندو' مسلم آبادی کے تعلقات کی ایک خاص مسابقانہ نوعیت کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں' فرقہ وارانہ تنظیموں کے لیے ضروری تھا کہ غیر مذہبی موضوعات کا سہارا لے کر ہجوم کو ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے بھڑکائیں۔ اس صورتِ حال میں مملکت یا حکومت اپنے آپ کو غیر جانبدار ظاہر کرنا پسند کرتی۔ یہ فرقہ وارانہ تنظیمیں' جو موضوعات اٹھاتیں اور جس طرح عوام کو فرقہ وارانہ اغراض ومقاصد کے لیے ہموار کرتیں' اس سے انھیں جواز کی سند مل جاتی اور وہ اپنے آپ کو اپنے فرقوں کی حقیقی نمائندہ ظاہر کرسکتی تھیں۔

ہندوستان میں برطانیہ کا اقتدار قائم ہونے سے پہلے صرف ایک ہندو۔ مسلم تصادم کا پتہ چلتا ہے' جسے فساد کہا جاسکتا ہے۔ اس وقت کے مورخ خافی خان نے بیان کیا ہے کہ ایک ہندو نے اپنے مسلم پڑوسی کی مرضی کے خلاف اپنے گھروں کے مشترک احاطہ میں ہولی جلانے پر اصرار کیا۔ یہ جھگڑا ایک مسلم افسر کے پاس لے جایا گیا اور اس نے ہندو کے حق میں فیصلہ صادر کردیا۔ پھر ہندو نے ہولی جلائی۔ اگلے دن مسلمان نے اپنے پیغمبر کے نام پر ایک گائے کی قربانی کی۔ اس سے ہندو ہمسائے بھڑک اٹھے اور انھوں نے پڑوس کے مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ اس کے بعد جو جھگڑا ہوا' اس میں اس مسلمان کا 14 سالہ بیٹا مارا گیا' جس نے گائے کی قربانی کی تھی۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا اور وہ افغان فوجیوں کی مدد سے اس جھگڑے میں شریک ہوگئے۔ یہ جھگڑا تین چار دن تک جاری رہا' جس میں دونوں فرقوں کے متعدد افراد مارے گئے اور جائیداد واملاک کو بہت نقصان پہنچا۔ پھر دونوں فرقوں کے رہنماؤں نے امن بحال کرنے کے لیے بادشاہ سے فریاد کی۔

اس فساد کی تحریر شدہ تفصیل ایسا پہلا واقعہ ہے' جس میں فرقہ وارانہ فساد کے تمام

اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں۔ بیلی کی بیان کی ہوئی مثالیں اس سے کس طرح مختلف ہیں، یہ صرف اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے، جب ہم اُس وقت کی حکومت اور اس کے شہریوں کے تعلقات کی نوعیت کو سمجھیں۔ ساتھ ہی شہریوں کے مختلف طبقوں یا فرقوں کے باہمی تعلقات نیز قرونِ وسطیٰ کی حکومت کی نوعیت کو بھی سمجھ لیں۔

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ یا ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کی تاریخ بیان کرنے میں کئی مورخین انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں۔ ایک طرف محمد یٰسین[1] جیسے مورخ ہیں، جن کے مطابق عہد مغلیہ کے بیشتر حصہ میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان رواداری، ایک دوسرے کے ہمدرد، بھائی چارہ اور باہمی میل ملاپ موجود تھا۔ دوسرے انتہا پسند مورخوں نے ہندوستانی تاریخ میں مسلم دورِ حکومت کو مسلمانوں کے مظالم (بت شکنی، عورتوں کی آبروریزی، تبدیلیٔ مذہب، جزیہ، غارت گری اور قتل عام) کے مترادف قرار دیا ہے۔ یہاں مسلم دورِ حکومت کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ مقصود نہیں، البتہ کچھ رجحانات پر نظر ڈالنا ہمارے مطالعہ میں مدد دے گا۔

ہندو۔ مسلم تعلقات کا تجزیہ کرتے وقت اکثر و بیشتر مسلم دورِ حکومت کی بت شکنی کو اس تلخی کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے، جو آج بھی ذہنوں میں اضطراب پیدا کرتی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کئی مسلم حکمرانوں نے ہندو مندروں کو مسمار کیا۔ مگر یہ دعویٰ کر کے واقعات کی حد سے زیادہ آسان توجیہہ کر دی جاتی ہے کہ مندروں کو مسمار کرنے کی وجہ محض یہ تھی کہ مسلم حکمراں متعصب اور عدم روادار تھے۔ عام طور پر ہندو مندروں کی مسماری کا سبب سونا، چاندی اور جواہرات کا لالچ ہوا کرتا تھا، جن کا ذخیرہ مندروں میں موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محمود غزنوی سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے سومناتھ مندر تک پہنچا اور راستہ میں ہزاروں مندروں کو جوں کا توں چھوڑ دیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دولت کے لالچ کا شکار صرف مسلم حکمراں ہی نہیں ہوئے۔ کشمیر کے بہت سے ہندو حکمرانوں نے بھی مندروں کو لوٹا اور مسمار کیا۔ کشمیر کا راجہ ہرش ان میں سے ایک تھا، جس نے مندروں کو مسمار کیا اور لوٹا۔ اس نے لوٹ کا مال سرکاری خزانہ میں لانے کے لیے باقاعدہ ایک شعبہ قائم کر رکھا تھا۔[2]

مندروں کو مسمار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے حکمرانوں کو سیاسی فائدہ

---

[1] محمد یٰسین : اسلامی ہندوستان کی سماجی تاریخ (1958)

[2] کلہانہ۔ راج ترنگنی : ترجمہ رنجیت سیتارام پنڈت، صفحہ۔ 352

حاصل ہوتا تھا۔ کسی مذہب کی نشانیاں مٹا دینے سے شکست خوردہ آبادی میں فاتح کی غلامی قبول کرنے کے لیے نفسیاتی ماحول تیار ہو جاتا تھا۔ دشمن کا حوصلہ پست کردینے کا یہ طریقہ دنیا بھر میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ خود ہندوستان میں برہمن راجاؤں نے بودھوں اور جینوں کے جن مندروں کو مسمار کیا' ان کی تعداد مسلمانوں کے ہاتھوں مسمار کئے ہوئے مندروں سے زیادہ ہے۔ مسلم حکمرانوں نے جب اپنی حکومت باضابطہ قائم کرلی تو مندروں کو مسمار کرنے کے واقعات کم ہوگئے۔ اس کا منطقی سبب یہ تھا کہ جب اتفاق رائے سے مسلم حکومت کو تسلیم کرلیا گیا تو مندروں کو مسمار کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

عہدِ وسطیٰ کی مسلم حکومت کا رویہّ اپنی رعایا کے ساتھ کسی اور حکومت کے رویہّ سے مختلف نہیں تھا کیونکہ اسے کسی مذہب کی تبلیغ کی بجائے اپنی بقاء کی فکر زیادہ رہتی تھی۔ مسلم حکمرانوں نے مالیانہ وصول کرنے اور اپنی فوجی طاقت کو قائم رکھنے میں زیادہ دلچسپی لی۔ اس لیے مختلف مسلم شاہی خاندانوں نے ہندوؤں کو لگان کی وصولی کے محکمہ اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ مغلیہ سلطنت کے دور میں فوج اور محکمۂ مال میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہندو افسروں کا تناسب کافی بڑھ گیا۔ اس وقت تک مسلم دورِ حکومت کا زوال کافی حد تک ہو چکا تھا۔ یہ محض ایک اتفاقیہ بات نہیں تھی کہ مغل فوجوں کو دو مخالف طاقتوں (مہارانا پرتاپ اور شیواجی) سے لڑنا پڑا۔ مہارانہ پرتاپ اور شیواجی نے بذاتِ خود راجپوت جنرلوں اور افسروں کی قیادت کی۔

مسلم دورِ حکومت کا تفصیلی تجزیہ کئے بغیر مندرجہ بالا حقائق صرف اس لیے بیان کئے گئے ہیں کہ عہدِ وسطیٰ کی حکومت' جس میں مسلمانوں کا غلبہ تھا اور رعایا' جس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی' اس دور میں ہندو۔ مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو سمجھا جاسکے۔ ہندوستان میں نیشن اسٹیٹ (Nation State) کا قیام صرف انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں ممکن ہوا۔ اس وقت تک اقتدار کے ہر ایک مرکز میں جغرافیائی توسیع شامل ہوا کرتی تھی۔ مسلم حکمراں بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ تقریباً 500 سال تک دہلی مسلمانوں کے اقتدار کا مرکز رہا اور وہ ہر سمت میں اپنے اقتدار کو توسیع دینے میں لگے رہے۔ اس کوشش میں ان کا الگ الگ زمانہ میں الگ الگ طاقتوں سے مقابلہ ہوا۔ عام طور پر یہ جنگیں دو ریاستوں کے درمیان ہوتیں۔ بعض اوقات دونوں متحارب ریاستیں مسلم ہوتیں' مگر اکثر ایک ہندو اور مسلم ریاست میں جنگ ہوتی تھی۔ ان میں عوام کی شرکت برائے نام ہوتی اور دور دراز دیہاتوں اور شہروں میں آباد ہندو' مسلمانوں

کے تعلقات متاثر نہ ہوتے۔ کرسٹو فر بیلی کے دلائل کا تجزیہ کرتے وقت عوام کی روزمرہ زندگی میں عہد وسطیٰ کے مسلم اور بعد میں برطانوی عہد کے اثرات کا موازنہ کرنا ضروری ہے۔ برطانوی سامراجی ریاست نہ صرف اس برصغیر میں کسی بھی سابقہ دور کی حکومت کے مقابلے میں زیادہ جدید' طاقتور اور دخیل تھی بلکہ مرکوز اقتدار کی مالک تھی' یہ حکومت شعوری طور پر خود کو سماج سے بالاتر اور غیر جانبدار رکھے ہوئے تھی اور کسی بھی پچھلی حکومت کے مقابلے میں سماج سے جدا تھی۔ یہ ایک ایسی حیثیت تھی' جو کسی سابقہ ریاست (حکومت) کو نہ تو حاصل تھی اور نہ کسی کو اس کی خواہش ہوئی[1]

عہد وسطیٰ میں حکومت' شہریوں کی روزمرہ زندگی اور سرگرمیوں میں دخیل نہیں ہوتی تھی۔ خاص طور سے جب حکومت جغرافیائی اعتبار سے وسیع ہوتی تو دور دراز سے اس کا تعلق صرف لگان کی وصولی اور اس طریقہ سے اپنی حاکمیت قبول کرالینے تک محدود رہتا تھا۔ یہ وسیع بادشاہت انتہائی ڈھیلی ڈھالی ہوتی اور در حقیقت اس حکومت میں مرکزی اقتدار سے مقامی صوبیداری کا اثر ظاہر ہوتا تھا۔ اگر صوبیدار مرکزی حکومت یا بادشاہت کو وقت پر لگان دیتے رہتے اور جنگ کے وقت اپنی ذمہ داریوں سے منہ نہ پھیرتے تو مرکزی اقتدار اور ان کے درمیان تعلقات خوشگوار رہتے۔ نو آبادیاتی برطانوی حکومت نے تعلقات کے اس توازن کو یکسر بدل دیا۔ 1757ء کی پلاسی کی جنگ کے بعد سے ہی برطانوی حکومت کی موجودگی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں باضابطہ طور پر مختلف صورتوں میں محسوس کی جانے لگی اور 1857ء تک مختلف اداروں کی شکل میں یہ حکومت عوام کی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کرنے لگی۔ بنگال' مدراس اور بمبئی پریسیڈنسی کی پلٹنیں پورے ملک میں الگ الگ تعینات کردی گئیں۔ ٹیلی گراف جیسے مواصلاتی ذرائع کا وسیع پیمانے پر استعمال ہونے لگا۔ 1847ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی قائم ہوئی اور اگلے کچھ برسوں میں تیزی سے ریلوے لائنیں بچھادی گئیں۔ ریلوے کا قیام نہ صرف اس لیے کیا گیا کہ کپاس جیسی خام اشیاء انگلینڈ کو برآمد کی جائیں اور وہاں سے تیار کپڑوں کو ہندوستان میں درآمد کیا جائے' بلکہ ریلوں کا جال بچھانے کا مقصد تجارتی فوائد کے علاوہ فوجی پلٹنوں کو تیزی سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانا بھی تھا۔ اسی لیے ریلوے لائنیں بچھانے اور ان کا طول و عرض متعین کرنے میں فوجی ماہرین سے مشورے

---

[1] گیانندر پانڈے۔ نو آبادیاتی شمالی ہند میں فرقہ واریت کا فروغ صفحہ 16

کیے گئے۔ 1857ء کے غدر سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ریلوے سے حکومت کے دخیل ہونے میں کتنی مدد ملی۔ اگر کلکتہ میں رانی گنج (تقریباً 120 میل) تک ریلوے لائن نہ ہوتی اور کرنل نیل کو اپنی پلٹن کے ساتھ رانی گنج کی ٹرین نہ مل گئی ہوتی تو یقیناً انگریزوں کو بنارس' الٰہ آباد اور کانپور کی چھاؤنیوں تک وقت پر پہنچانے میں اور زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

برطانوی ہند میں ایک جیسا پولیس نظام اور قانون وانتظام کے اداروں کے قیام کی وجہ سے حکومت کا وجود زیادہ مؤثر اور عوامی زندگی کو متاثر کرنے لگا۔ 1861ء میں پولیس ایکٹ' تعزیرات ہند' ضابطہ فوجداری اور قانونی شہادت جیسے ذرائع کی مدد سے جدید معنوں میں ایک قومی مملکت (Nation State) قائم کرنے میں مدد ملی اور ہر ایک شہری کو حکومت تک رسائی حاصل ہوئی۔ مالیانہ کی وصولی کے لیے افسر شاہی قائم کی گئی اور ہر ایک گاؤں میں حکومت کا نمائندہ مقرر کیا گیا۔

یہ حکومت نہ صرف عہد وسطیٰ کی حکومتوں سے کہیں زیادہ دخیل تھی بلکہ زیادہ غیر حساس بھی تھی' اس کے غیر حساس ہونے کی کئی ٹھوس مثالیں موجود ہیں۔ چند ابتدائی مثالوں کو چھوڑ دیں تو مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا۔ وہ نہ تو ہندوستان کی دولت کو کہیں دور لے جانا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنے گماشتوں کے ذریعہ دور بیٹھ کر ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ اس ملک میں جینے مرنے اور یہاں کے عوام کے ساتھ اپنے وجود کو مانوس کرنے کی شدید خواہش نے انھیں نہ تو یہاں کی دستکاری اور صنعت وحرفت کو ضائع کرنے پر آمادہ کیا اور نہ ایسی حکومت کا خیال آنے دیا۔ انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنی رعایا کی بہبود کا خیال رکھیں۔

دوسری طرف ان عوامل کی عدم موجودگی اور ہندوستانی پیداواروں کے ساتھ اقتصادی میدان میں مقابلے کے جذبہ نے برطانوی حکمرانوں کو مقامی دستکاروں اور صنعتوں کو برباد کرنے اور ایسی ریاست یا حکومت قائم کرنے پر مجبور کیا جو شہریوں سے الگ تھلگ رہی اور ساتھ ہی ان کی زندگی میں بے حسی کے ساتھ دخل اندازی کرتی رہی۔ ایڈمنڈ برک نے مسلم عہد حکومت اور برطانوی دور حکومت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ برطانوی حکومت نے صرف ہندوستانی عوام کو بدحال بنایا۔

مسلم اور برطانوی حکومت کے درمیان اسی فرق نے انگریزوں کو "پھوٹ ڈالو اور

حکومت کرو" کا اصول اپنانے پر مجبور کیا۔ 1857ء کے غدر کے فوراً بعد ایلفن اسٹون نے سامراج کا نظریہ یوں بیان کیا "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" رومن سلطنت کا پرانا اصول تھا جیسا کہ ہمارا ہونا چاہئے" اس کے برعکس مسلم حکومت کو عوام پر حکومت کرنے کے لیے 'پھوٹ ڈالو' کی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

"پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کا منطقی نتیجہ فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں نمودار ہوا اور حکومت کی دانستہ کوشش یہی نتیجہ پیدا کرنے کی تھی۔ پہلے ایک مسلم نواب اور ایک ہندو راجا آپس میں ٹکراتے تھے اور اکثر دونوں کی فوجوں میں ہندو اور مسلمان مشترک فوجی افسر اور سپہ سالار ہوا کرتے تھے تاہم ہندو اور مسلم شہری آبادی کے تعلقات پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا تھا۔ لیکن اب چونکہ حکومت توسیع پسند بن گئی تھی اور بڑی حد تک کرایہ کے سپاہیوں پر مشتمل تھی تو اس کی پالیسیوں کے نتیجہ میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ برطانوی سامراج نے کس طرح فرقہ وارانہ فسادات کو بھڑکانے میں حصہ لیا' اس پر ہم ذرا بعد میں روشنی ڈالیں گے اور یہ بتائیں گے کہ برطانوی نو آبادیاتی حکومت نے کس طرح فسادات کو بھڑکانے میں شدید بے عملی کا مظاہرہ کیا۔ سب سے پہلے ہم اس دلیل کا جواب تلاش کریں گے کہ اگر انگریز فرقہ وارانہ فسادات کراتے تھے تو پھر یہ سلسلہ اب تک کیوں جاری ہے' جبکہ برطانوی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے؟ یہ دلیل کچھ ٹھوس حقیقتوں کو ناکافی طور پر سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ملک کو آزادی تکلیف دہ ناخوشگوار فرقہ وارانہ واقعات کے پس منظر میں ملی ہے۔ قومی تحریک کو ہندو بنانے کی غلطی' علاحدہ انتخابی نظام' مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا جیسی فرقہ پرست جماعتوں کا آہستہ آہستہ ہندوستانی سماج میں زور پکڑنا' فرقہ وارانہ صف آرائی اور خطرناک فرقہ وارانہ فسادات ایسے اسباب و محرکات تھے جن کے نتیجہ میں ملک تقسیم ہوا۔ تقسیم کے دوران لاکھوں لوگ مارے گئے اور کروڑوں بے گھر ہو گئے۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی فرقہ وارانہ فسادات کا جاری رہنا' تقسیم ملک کی ناخوشگوار اور تکلیف دہ یادوں اور اکثر دلیاں بازو سیاسی پارٹیوں کے طبقاتی کردار کا نتیجہ ہے' کیونکہ یہ پارٹیاں کبھی فرقہ وارانہ فساد کرانے سے نہیں چوکتیں بشرطیکہ اس میں ان کا سیاسی فائدہ ہو۔ اگلے باب میں ہم نے اس پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد فرقہ وارانہ فسادات جاری رہنے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات میں برطانوی حکومت کی اعانت

فرقہ وارانہ فسادات میں برطانوی حکومت کی اعانت اور کردار کا تحقیقی مطالعہ کرتے وقت انگریزوں کی آمد سے قبل کچھ تاریخی واقعات پر بطور ثبوت نظر ڈالنا کارآمد ہوگا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ہندو۔مسلم تعلقات میں کئی بار ایسی کشیدگی پیدا ہوئی کہ اگر حکومت ذرا بھی چشم پوشی اور اعانت کرتی تو آنے والے برسہابرس کے لیے اس کے نتائج تباہ کن ہوتے۔اس طرح کی کشیدہ صورت حال کا تذکرہ ابن بطوطہ کے سفر ناموں میں ملتا ہے[1] وہ 15ویں صدی کے اوائل میں جنوبی ہند کے منجاسور (غالباً منگلور) کے رام دیو نامی حکمراں کے دور کی ایک مسلم بستی کا ذکر کرتا ہے، جس میں تقریباً 4000 مسلمان آباد تھے۔ وہ ان مسلمانوں اور شہر کے دوسرے لوگوں کے درمیان متواتر ہونے والی جھڑپوں کا حوالہ دیتا ہے اور یہ بیان کرتا ہے کہ شہر میں امن وامان قائم رکھنے میں ہندو راجہ (رام داس) کا کیا کردار ہوتا تھا۔ راجہ کو مسلمانوں کی تجارتی اہمیت کا احساس تھا، اس لیے وہ دونوں فرقوں میں صلح و صفائی کراتا رہتا تھا۔ ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر حکومت ان جھڑپوں کو بڑھاوا دیتی یا حکومت کرنے کی غرض سے دو مختلف فرقوں میں پھوٹ ڈالنا اس کے لیے ضروری ہوتا تو یہی جھڑپیں بڑے فرقہ وارانہ فسادات میں تبدیل ہو جاتیں۔

احمد آباد کا 1713ء کا فساد' جدید معنوں میں ہندوستان میں پہلا فرقہ وارانہ فساد تھا' جس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔اس میں بھی حکومت کی سرگرم شرکت نظر نہیں آتی۔جہاں یہ بات سچ ہے کہ فساد کے دوران شہر میں موجود افغان فوجیوں نے اپنے ہم مذہب لوگوں کی طرف داری کی اور جھگڑے میں حصہ لیا تاہم دونوں فرقوں کے رہنماؤں نے آپس میں صلاح و مشورہ کر کے راجہ سے فریاد کی کہ وہ دونوں فرقوں میں مصالحت کرائے۔اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کو یہ اعتماد تھا کہ راجہ امن وامان قائم رکھنا چاہتا ہے۔

"تاریخ ہندی"[2] نام کی کتاب میں رستم علی 1759ء میں دہلی کے ایک جھگڑے کا واقعہ بیان کرتا ہے، جس میں ایک بڑے ہندو۔ مسلم فساد کے بیج موجود تھے۔ واقعہ یوں

---

[1] ابن بطوطہ کا سفر ایشیا و افریقہ صفحہ 34-233 ترجمہ ابن بطوطہ کے سفری تجربات از ایچ۔اے۔آر۔گب

[2] ایلیٹ اینڈ ڈاوسن: تاریخ ہند' جلد 8' صفحہ 48

ہے۔ سبھا کرن نام کے ایک ہندو نے شعبان کے مہینہ میں ایک مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس پر جامع مسجد کے علاقہ میں مسلمانوں نے ہنگامہ کیا اور اس قتل کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا۔ کچھ شاہی ملازمین نے اس موقع پر ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ پھر جمعہ کے روز تقریباً 3 بجے سہ پہر ایک بڑا فساد ہوا اور مسجد کے علاقہ میں 17 افراد مارے گئے۔ اس لڑائی میں بادشاہ کا خاص خدمت گار شیر افگن خاں بھی زخمی ہو گیا۔ لیکن روشن الدولہ کی مدد سے کسی طرح اس کی جان بچ گئی۔ اگرچہ رستم علی نے فساد کے اسباب کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اتنے شدید فساد کا کوئی خاص سبب ہوگا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس جھگڑے میں ایک سرکاری عہدیدار شدید زخمی ہوا، یہ جھگڑا پھیل نہ سکا اور ایک دن سے زیادہ دیر تک جاری نہ رہا۔ نیز حکومت نے کسی بھی طرح اس کو بڑھاوا نہیں دیا۔

ان مثالوں کے مقابلے میں ذرا ایسی مثالوں پر بھی غور کریں جو برطانوی حکومت کے کردار پر روشنی ڈالتی ہیں۔ صرف تین واقعات کا ذکر کافی معلوم ہوتا ہے۔ یہ تین واقعات برطانوی حکومت کے قیام واستحکام کے بعد تین مختلف مقامات پر تین الگ الگ مدتوں میں ہوئے۔ 58-1857ء کی بغاوت (غدر) کی ناکامی کے بعد اجودھیا میں بابری مسجد۔رام جنم بھومی تنازعہ کے سلسلے میں حکومت کا طرزِ عمل، 1931ء میں کانپور کے فساد میں انتظامیہ کا کردار اور 1946ء میں برطانوی افسر شاہی کا مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن کے موقع پر ہلاکتوں کو روکنے سے انکار۔ ایسی مثالیں ہیں جن کا تجزیہ کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کو بڑھاوا دینے میں برطانیہ کا کردار کیا رہا ہے۔

یہ ایک محض اتفاقی بات نہیں کہ بابری مسجد۔رام جنم بھومی تنازعہ یا مندر کو مسمار کر کے اس کی جگہ بابری مسجد تعمیر کرنے کا ذکر سب سے پہلے ایچ آر نویل کے مرتب کئے ہوئے فیض آباد کے ضلع گزیٹیر میں کیا گیا ہے۔ مبینہ طور پر مندر کو مسمار کر کے مسجد بنانے کے عہد میں سرگرم "آئین اکبری" کے مصنف ابوالفضل اور اس وقت کے سب سے بڑے رام بھکت اور رام کتھا کے شاعر گوسوامی تلسی داس ایسے کسی بھی واقعہ کا ذکر نہیں کرتے۔ صرف ایچ۔ آر۔ نویل ہی یہ لکھتا ہے کہ پرانی مسمار شدہ یادگار عمارت (مندر) کے ملبہ کو نئی تاریخی عمارت (مسجد) کی تعمیر کے لیے استعمال کیا گیا۔ 19ویں صدی میں ہی مندر کو توڑ کر مسجد بنانے کی کہانی مشہور کی گئی اور سرکاری دستاویزات میں اس کا ذکر کیا گیا۔ ان دلائل کو بعد

میں تاریخی واقعات بنالیا گیا اور اسی حیثیت سے ان کا پروپیگنڈہ کیا گیا[1] اس سے قبل کسی تاریخ میں اس اِدّعاء کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مندر کو مسمار کیا گیا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس مقام کے کسی حصہ کو ہندو پوجا پاٹھ کے لیے استعمال کرتے ہوں۔

1608ء اور 1611ء کے درمیان یورپی سیاح ولیم فنچ اجودھیا میں بابری مسجد کے احاطہ میں پہنچا۔ اس نے لکھا ہے کے ہندوؤں کو پوجا پاٹھ اور دیگر رسوم ادا کرنے کی اجازت تھی۔ اس نظم کے باوجود کسی خونی لڑائی کا کوئی ذکر کسی تاریخی دستاویز میں نہیں ملتا۔ مندر۔مسجد کے مقام پر سب سے پہلے تنازعہ کا ذکر ہم پہلے ہی تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ یہ تنازعہ 1853ء اور 1855ء میں ہوا تھا۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ 1816ء کے معاہدہ کی شرائط کی رو سے مولوی امیر علی کے اعلان جہاد کے بعد انھیں روکنے کی ذمہ داری انگریزوں کی تھی۔ لیکن انہوں نے اس ذمہ داری کو پورا کرنے سے انکار کردیا۔ نواب واجد علی شاہ نے اپنی فوج بھیج کر مولوی امیر علی کو سزا دی اور فریقین میں سمجھوتہ کرایا۔ دونوں طرف کے سرکردہ لوگوں نے آپس میں معاہدہ کیا جس کے مطابق مسجد کے باہر شمال میں چبوترہ پر ہندو پوجا پاٹھ کر سکتے تھے اور مسلمان مسجد کے اندر نماز ادا کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ ہی وہ انتظام تھا جس کا ذکر ولیم فنچ نے کیا تھا۔ جس کے بارے میں بینٹ نے لکھا ہے کہا جاتا ہے کہ اس وقت (1857ء کی بغاوت) سے قبل تک مسلمان اور ہندو ایک ساتھ مندر و مسجد میں عبادت کرتے تھے۔[2]

یہاں یہ بتادینا مناسب ہوگا کہ ایودھیا کو مذہبی اعتبار سے فروغ دینے میں اودھ کے نوابوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اٹھارویں صدی میں پہلی بار ایودھیا ایک اہم تیرتھ استھان کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔ نواب صفدر جنگ کے وزیر راجا دیوان رائے نے بہت سے مندروں کی مرمت کرائی اور نئے مندر تعمیر کرائے۔ نواب صفدر جنگ نے خود ہنومان کے ایک بڑے مندر کے لیے زمین دی۔ اس زمین پر تعمیر شدہ ہنومان گڑھ مندر کی تعمیر میں نواب آصف الدولہ کے دیوان تکیت رائے کا بھی تعاون رہا۔ پیٹروان ڈیرویر کے مطابق نواب کے درباری مسلم افسران ہندو تنظیموں اور پجاریوں کو مذہبی تعمیرات کے لیے عطیہ دیتے رہتے تھے۔[3]

---

[1] "فرقہ وارانہ تاریخ اور رام کی ایودھیا" از: آر۔ایس۔ شرما

[2] ڈبلیو۔ای۔ بینٹ گزیٹیر آف لکھنؤ (1877ء) صفحہ۔7

[3] پیٹروان ڈیئرویر۔ بھگوان کو آزاد کراناچاہئے

پیٹر وان ڈیر ویر' مائیکل فشر اور جے آئی آر کول[1] نے اس وقت کے واقعات کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ کس طرح نواب واجد علی شاہ کی طاقت میں کمی اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ایودھیا کے تنازعہ کو نہ صرف ہوا دی بلکہ اسے ایک ایسے ناسور میں تبدیل کر دیا جو ہندوستانی سماج کو آج تک تکلیف دے رہا ہے۔ ایودھیا کا تنازعہ انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے لیے سب سے کارآمد تھا کیونکہ اس میں ہندوستانی سماج کے کچھ بنیادی آپسی اختلافات پوشیدہ تھے اور اسی لیے انھوں نے نہ صرف اسے زندہ رکھا بلکہ اپنی طرف سے اسے مزید بڑھانے کی پوری کوشش بھی کی۔

کانپور فساد - 1931ء

1931ء میں کانپور میں ہونے والا فرقہ وارانہ فساد اس لحاظ سے بڑا سنگین تھا کہ اس وقت تک یہ فساد شمالی ہندوستان میں جان و مال کے نقصان کے لحاظ سے سب سے زیادہ شدید تھا۔ جس میں مصدقہ خبروں کے مطابق 290 لوگ مارے گئے (108 ہندو' 116 مسلمان اور 66 نامعلوم) اور 947 (368 ہندو' 292 مسلمان اور 305 نامعلوم) افراد زخمی ہوئے۔ اس کے علاوہ کم سے کم پچاس لاشیں ندیوں اور نہروں میں پھینک دی گئیں یا جلادی گئیں۔ غیر سرکاری خبروں کے مطابق مرنے والوں کی تعداد 500 سے زیادہ تھی۔ اندازہ لگایا گیا کہ اس فساد میں پچاس لاکھ سے زیادہ کی املاک تباہ ہوئی۔ فساد سے متعلق 1700 مقدمات درج کیے گئے۔ جن میں 84 قتل' 81 اقدام قتل' 1203 ڈکیتی' 74 راہزنی اور 91 مقدمے فساد کے تھے۔ 29 مندر' 8 مٹھیا (چھوٹے مندر) اور 24 مسجدوں کو نقصان پہنچایا گیا۔

یہ سب کچھ صرف چار دن میں ہوا۔ فساد 24/ مارچ کو دوپہر بعد شروع ہوا لیکن اس میں شدت 25/ مارچ سے آئی۔ 25، 26، 27، اور 28/ مارچ کو فساد نقطہ عروج پر پہنچ گیا اور 29 اور 30/ مارچ کو کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ اس فساد میں گنیش شنکر ودیارتھی جیسے محب وطن لیڈر کو مار دیا گیا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمان دونوں میں یکساں ہر دلعزیز تھے۔ اس فساد کی

---

[1] آئی بی آئی ڈی' نیز مائیکل فشر۔ دو ثقافتوں کا ٹکراؤ: اودھ' برطانیہ اور مغل صفحہ: 228 تا 236 اور جے آر آئی کول: مذہب اور مملکت ایودھیا میں' 1772' 1859 صفحہ: 49-244

تحقیقات کے لیے دو کمیشن قائم کیے گئے۔ ایک کمیشن حکومت نے قائم کیا تھا جس میں ریونیو بورڈ ممبر ایم کین کو صدر اور آگرہ کے ضلع جج جی ایل او ایلن' پنڈت بل دیو رام دوے (صدر امپر و مینٹس الٰہ آباد) اور نواب زادہ محمد لیاقت علی خاں (ممبر یوپی کونسل) شامل تھے۔ اس کے علاوہ کانگریس پارٹی نے ڈاکٹر بھگوان داس کی صدارت میں ایک غیر سرکاری تحقیقاتی کمیشن قائم کیا۔ جس میں خاص طور سے پرشوتم داس ٹنڈن' خواجہ عبدالمجید' ٹی۔ اے۔ کے۔ شیر وانی' ظفر الملک اور پنڈت سندر لال ممبر نامزد کیے گئے تھے' لیکن خواجہ عبدالمجید اور ٹی۔ اے۔ کے۔ شیر وانی نے اپنے ذاتی اسباب کی بنا پر رکنیت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کی جگہ منظر علی سوختہ اور عبداللطیف کمیشن کے رکن بنائے گئے۔ سرکاری افسروں نے کانگریسی کمیشن کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ سے کانگریس کے کارکنوں نے سرکاری کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ دونوں کمیشنوں کے سامنے پیش ہونے والے گواہوں کے بیانات اور فرقہ وارانہ فساد کو روکنے میں حکومت کی نیت اور طرزِ عمل سے متعلق اہم انکشافات ہوئے۔

الٰہ آباد ڈویژن کے کمشنر کنور مہاراج پرساد کانپور کے ضلع مجسٹریٹ جے۔ ایف۔ سالے اور پولیس کمشنر ای۔ ایم۔ راجرس نے سرکاری تحقیقاتی کمیشن کے سامنے متفقہ طور پر یہ کہا کہ فسادات پر قابو پانے میں ناکامی کا واحد سبب یہ ہے کہ کانپور میں فساد کے وقت کافی پولیس موجود نہ تھی۔ بعد میں اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا' لیکن اس کمیشن کے سامنے پیش کی جانے والی کچھ دوسری شہادتوں اور سرکاری افسروں کی طرف سے پیش کیے گئے کاغذات میں کچھ اور کہانی بیان کی گئی۔

سرکاری کمیشن کے سامنے دیے گئے بیانات کا تجزیہ کرتے وقت یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اس کمیشن کے سامنے پیش ہونے والے اکثر افراد برطانوی حکومت کے وفادار تھے۔ حکومت کے وفادار ہی جب یہ کہیں کہ فسادات کے دوران پولیس بے عمل تماشائی بنی رہی تو اسے تسلیم کرنے کے بعد پولیس کی نیت کی جانچ کرنی ہوگی۔

فوجی افسروں' اینگلو انڈین شہریوں' ہندوؤں' مسلمانوں' تاجروں اور کارخانہ داروں سبھی نے فساد کے پہلے دنوں میں انتظامیہ کے مشتبہ کردار کا ذکر کیا ہے۔ درحقیقت 25/اور 26/مارچ کو فساد کے بدترین دو دنوں میں فوج کو مؤثر طریقے پر محض اس لیے استعمال نہیں کیا

گیا کہ افسر شاہی میں اس بات پر اختلافات تھے کہ فوج کو کس طرح تعینات کیا جائے اور اس کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے۔

پولیس کی ناکافی موجودگی فساد کے بے قابو ہونے کا سبب تھی یا انتظامیہ کی ڈھیل اس کا سبب ہوئی یہ فیصلہ کرتے وقت ہمیں مندرجہ ذیل سرکاری افسروں کے بیانات کے کچھ اقتباسات کا جائزہ لینا ہوگا۔ ضلع مجسٹریٹ' سپرنٹنڈنٹ پولیس اور اے ایس پی نے کمیشن کے روبرو فسادیوں کے خلاف مؤثر کارروائی میں ناکامی کے اسباب بیان کیے۔ جب ان افسروں سے کمیشن کے ممبروں نے بار بار یہ پوچھا کہ فسادیوں کو گرفتار کرنے یا ان پر گولی چلانے سے کیوں قاصر رہے تو انھوں نے جواب دیا کہ چھرے بازی' آتش زنی اور پتھراؤ کے بعد فسادی لوگ گلیوں اور کوچوں میں بھاگ جاتے تھے' پولیس نفری ناکافی تھی اس لیے انھیں پکڑنا ممکن نہیں تھا' لیکن پولیس افسروں اور حکام کے علاوہ دیگر گواہوں نے بیان میں کہا کہ پولیس آتش زنی اور قتل جیسی وارداتوں کو محض تماشائی بن کر دیکھتی رہی اور اس نے ذرا بھی مداخلت نہیں کی۔

پولیس نے کتنی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا' اس کا اندازہ سپرٹنڈنٹ پولیس ای۔ایم۔ راجرس کا کمیشن کے روبرو بیان پڑھنے سے ہوتا ہے۔ جس میں پولیس فائرنگ کے واقعات کی فہرست دی گئی ہے۔اس فہرست کے مطابق پولیس نے 13 مواقع پر فسادیوں پر گولی چلائی لیکن 6 مرتبہ اس وقت جب پولیس پر فسادیوں نے حملہ کیا اور اس نے اپنی مدافعت کی' تین مرتبہ حفاظتی عملہ نے جو ڈیوٹی پر تعینات تھا' سرکاری رہائش گاہوں کو بچانے کے لیے گولی چلائی اور صرف چار مرتبہ فساد کو قابو پانے کے لیے گولی چلائی ہے۔ایک ایسے فساد میں جس میں سرکاری رپورٹوں کے مطابق تقریباً 300 افراد مارے گئے' سپرٹنڈنٹ پولیس نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ پولیس کی فائرنگ سے صرف ایک فسادی ہلاک ہوا۔ راجرس اور دوسرے افسروں کے بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بلوائی پولیس یا فوج سے ٹکراؤ کے لیے بیتاب نہ تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ پولیس میں ان سے نمٹنے کا عزم موجود نہیں تھا۔ پولیس کا برتاؤ ان کے ساتھ کیا تھا' یہ حقیقت ان گواہوں کے بیانات سے ظاہر ہو جاتی ہے جو کانگریس کے مقرر کردہ اس تحقیقاتی کمیشن کے روبرو پیش ہوئے' جس کے صدر ڈاکٹر بھگوان داس تھے۔

جس وقت کانگریس کمیٹی کے سکریٹری شری پیارے لال کا گھر لوٹا جا رہا تھا' تو شہر کوتوال خود ان کے گھر سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ پتمبر لال اگروال اور

مہابیر اوجھانے کوتوال سے کہا کہ شری پیارے لال کا گھر لوٹا جا رہا ہے۔ ان دونوں نے درخواست کی کہ کے گھر کو لٹنے۔ سے بچایا جائے لیکن کوتوال نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

اسٹیشن آفیسر، کوتوال، رام کرن سنگھ مبینہ طور پر قریب کھڑے ہوئے تھے اور چوک بازار میں مسلمانوں کی دکانیں لوٹی جا رہی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلم دکانداروں نے بار بار ان کے پاس جا کر درخواست کی کہ کوتوال صاحب مداخلت کریں اور انھیں اس لوٹ مار سے بچائیں، لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔ جب یوپی کے سب سے بڑے ہوزری (موزابنیان) تاجر عبدالحق نے دیکھا کہ ان کی دکان لوٹی جا رہی ہے تو انھوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کوتوال کے قدموں پر اپنی ٹوپی رکھ کر یہ فریاد کی کہ ان کی دکان کو لٹنے سے بچایا جائے۔ لیکن کوتوال نے اپنا منہ پیچھے کی طرف پھیر لیا۔ اس وقت رام کرن سنگھ کے ساتھ ایک ڈپٹی مجسٹریٹ بھی تھا، مگر عبدالحق کی فریاد کا کوئی اثر ان میں سے ایک پر بھی نہ ہوا۔

دونوں تحقیقاتی کمیشنوں میں یہ بات یکساں طور پر بیان کی گئی کہ فساد کا سبب یہ نہیں تھا کہ پولیس فورس موجود نہ تھی، بلکہ وجہ یہ تھی کہ سرکاری مشنری کا رویہ محض بے عملی کا مظاہرہ ہی نہیں تھا، بلکہ اس نے بلوائیوں کی ہمت بڑھائی۔

کلکتہ فساد – 1946ء

1946ء میں بنگال میں مسلم لیگی حکومت نے "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر کلکتہ میں جو فساد ہوا، وہ ہمارے تحقیقی مطالعہ کے لیے کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اس وقت تک تقریباً یہ طے ہو چکا تھا کہ ہندوستان جلد ہی آزاد ہو جائے گا اور اس فساد کو روکنے کی ذمہ داری بھی ہندوستان ہی کی تھی۔ لیکن ابھی تک نوکر شاہی کا ایک بڑا حصہ انگریز افسروں پر مشتمل تھا۔ ان آئی سی ایس یا آئی پی ایس افسران پر عوام کے منتخب نمائندوں کا اختیار برائے نام تھا۔ فوج، جو فسادات کو روکنے میں شہری افسران کا موثر ڈھنگ سے ساتھ دے سکتی تھی ابھی تک منتخب نمائندوں کے اختیار سے باہر تھی۔ اس فساد میں گوری نوکر شاہی ایک جھنجھلائی ہوئی تنظیم کی شکل میں سامنے آتی ہے جو منتخب حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے مسلسل انکار کر کے یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ یہ حکومت فساد پر کنٹرول کرنے کی اہل نہیں ہے مزید یہ کہ ہندو اور مسلمان تو

آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں اس لیے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اور زیادہ لڑیں گے۔

یہ بات بڑی عجیب ہے کہ جو طاقتیں فساد کی ذمہ دار تھیں وہی برسر اقتدار تھیں لیکن جب انھوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو فوج اور پولیس کے عدم تعاون کی وجہ سے بری طرح ناکام ہو گئیں۔ 16/اگست کو جب فساد شروع ہوا تو ابتدا میں مسلمان حاوی تھے لیکن حالات جلدی ہی بدل گئے۔ کچھ ہی گھنٹوں کے اندر مسلمانوں کا ہولناک قتل عام شروع ہو گیا۔ مسلم لیگ کی سرکار اور اس کے وزیر اعظم سہروردی امن قائم کرنے کے لیے انگریز پولیس افسران اور فوج کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اِدھر سے اُدھر بھاگتے دوڑتے رہے۔ لیکن فساد کو کچلنے کے لیے انھیں انگریز افسروں کی کوئی مدد نہ مل سکی۔ اس کی تفصیل 19/اگست 1973ء کے ''السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا'' کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ تفصیل پی ایس ماتھر نے بیان کی ہے۔ ماتھر اس وقت بنگال سرکار کے اعلیٰ عہدے پر تعینات تھے۔ انھوں نے اس وقت کے انگریز پولیس کمشنر ہارڈوک کی ہٹ دھرمی پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ مسٹر ماتھر کے مطابق ''میں نے کنٹرول روم میں کچھ بہت ہی حیران کن گفتگو سنی' جب پولیس کمشنر سے فون پر درخواست کی گئی کہ وہ شہر پولیس کے یوروپین سارجنٹوں کو بھیجیں تو فون کرنے والے کو نرم لہجے میں بتایا گیا کہ ''کیا بولے گا مسٹر' آپ جو مانگتا ہے اس ٹائپ کا سارجنٹ تو آپ کے حکم کے ساتھ ہی انڈیا چھوڑ گیا''۔

ایک دوسرے موقع پر ہارڈوک نے کہا: ''میں آپ کے معاملوں میں دخل دینے والا کون ہوتا ہوں؟ ہندو چاہتے ہیں کہ ہم چلے جائیں' مسلمان چاہتے ہیں کہ ہم ملک ان کے حوالے کر دیں' میں کچھ نہیں کر سکتا آپ کانگریس دفتر کو فون کیوں نہیں کرتے''؟

مسلم لیگ کے وزیر اعظم کے سر یہ سہرا باندھنا چاہئے کہ اس نے فوج کو بلانے پر زور دیا۔ یوروپی حکمرانوں نے اس کی مخالفت کی اور ہونے کے باوجود فوج نہیں بلائی گئی۔ یہ مثال یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اگر انتظامیہ متحرک نہ ہو تو کیسی تباہی پھیل سکتی ہے۔

1858ء میں بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ کو ہوا دینا اور 1931ء میں کانپور کے فسادات کو نہ روکنے کے پس پشت جہاں برطانوی ذہنیت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دے کر ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کا رجحان کام کر رہا تھا' وہیں 1946ء کے کلکتہ فساد میں منتخب حکومت کی مدد کرنے سے انکار کرنے کے پس پردہ ایک ایسی جھنجھلاہٹ

دکھائی دیتی ہے جو ہاتھ سے اقتدار نکلتے دیکھ کر ہمیشہ اس گمان میں رہتی ہے کہ گوروں کے جاتے ہی ملک تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اس جھنجھلاہٹ میں وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ جدید معنوں میں فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات ہندوستان کو خاص کر سامراجی حکمرانوں سے ہی ملے ہیں۔ برطانوی حکمراں کتنی شدت سے یہ مانتے تھے کہ ان کے جاتے ہی ہندوستان تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گا۔ اسے سمجھنے کے لیے چرچل کے ذریعہ پارلیمنٹ میں دیئے گئے اس بیان کے ایک اقتباس کو پڑھنا کافی ہوگا۔ جو انھوں نے بہار میں 1946ء کے خطرناک فساد کے بعد دیا تھا۔ 12/ دسمبر 1946ء کو برطانوی ہاؤس آف کامنز (دارالامان) میں بولتے ہوئے انھوں نے ان واقعات کو طوفان ٹوٹ پڑنے سے پہلے بارش کی چند بوندیں یا مستقبل میں ہونے والے واقعات کی گونج بتایا تھا۔ انھوں نے کچھ معتبر ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ بہار نے ان آرمینیائی مظالم کو پیچھے چھوڑ دیا ہے جن کے حوالے سے کبھی گلیڈ اسٹون نے اعتدال پسند برطانیہ کی اصول پرستی کو جھنجھوڑا تھا۔

چرچل اپنی تقریر میں یہ بات بھول گئے کہ جس طوفان یا طوفانی مستقبل کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے اس کو پیدا کرنے میں نو آبادیاتی برطانوی سامراجی حکومت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

فرقہ پرست طاقتوں کے ہاتھوں معاشی مسائل کا استحصال

فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات ہونے کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ہندوستانی سماج میں معاشی تعلقات غیر متوازن یا استحصال پسند رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علاقائی حقیقتوں کے توازن کو سیاسی طریقوں سے بدلنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ اکثر و بیشتر فرقہ وارانہ طاقتیں اپنے فرقہ کی اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے دوسرے فرقہ کے خلاف اس کا سہارا لیتی ہیں۔ ان کوششوں کے پس پردہ سیاسی اور مذہبی مقاصد پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر خالص معاشی یا اقتصادی تحریک کی غرض و غایت در حقیقت سیاسی اور مذہبی ہوتی ہے۔ جس سے تحریک میں شامل عام لوگ تو لاعلم ہوتے ہیں لیکن لیڈروں کو اس کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ عام لوگ آخر دم تک یہ محسوس نہیں کرتے کہ چند مخصوص مفاد پرستوں کا ٹولہ انھیں کس طرح چالاکی کے ساتھ استعمال کر رہا ہے۔ کیرالہ میں موپلہ باشندوں کی بغاوت، بنگالی

مسلمانوں کی ہندو جاگیرداروں کے خلاف جدوجہد اور گائے کے تحفظ کی تحریکیں اسی طرح کی مثالیں ہیں۔

موپلہ بغاوت

یہ بات سننے میں ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے، مگر یہ سچ ہے کہ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون نے ہی 22-1921ء میں موپلہ بغاوت کو جنم دیا۔ لیکن بغاوت کے اصلی اسباب مالابار کے سماج میں بھیانک ظلم وستم اور استحصال پسند زرعی تعلقات میں پوشیدہ تھے۔ ان اسباب کی بناء پر 1836ء سے 1919ء تک مالابار میں موپلہ مسلمانوں اور ان کے ہندو اور انگریز زمینداروں کے مظالم کے خلاف بہت سے جھگڑے ہوئے۔ 22-1921ء کی موپلہ تحریک اس لحاظ سے پچھلی سب تحریکوں سے مختلف تھی کہ اس نے سیکڑوں مربع کلومیٹر علاقے سے کئی ماہ کے لیے برطانوی حکومت کو بے دخل کردیا تھا۔ یہ تحریک سامراج مخالف ہونے کے علاوہ فرقہ وارانہ نوعیت کی بھی تھی۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق صرف ایرناڈ میں تین سو ہندو مندر تباہ کئے گئے اور نو سو ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنالیا گیا۔ تقریباً 20 ہزار ہندو اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے اور جو ہندو مارے گئے ان کی تعداد کئی ہزار تھی۔ ایک سامراج مخالف تحریک کیونکر بنیادی طور پر فرقہ پرست تحریک بن گئی، یہ جاننے کے لیے مالابار علاقے کے زرعی تعلقات کی نوعیت کو سمجھنا ہوگا۔

آزادی سے پہلے موجودہ کیرالہ کا شمالی حصہ مالابار ضلع مدراس پریسیڈنسی کا ایک حصہ تھا۔ مالابار ضلع شمال سے جنوب تک تقریباً ایک سو پچاس میل بحر عرب کی متوازی زمین کی ایک پٹی کی شکل میں موجود تھا اور اس کی چوڑائی کہیں بھی 70 میل سے زیادہ نہیں تھی۔ 1921 کی مردم شماری کے مطابق وہاں ہندو آبادی 66 فیصد تھی جو ذات پات کے کٹر نظام میں جکڑی ہوتی تھی[1] ہندو ذاتوں میں نمبودری سب سے اونچی ذات تھی۔ مردم شماری کے مطابق مالابار کی اکتیس لاکھ کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد بتیس فیصد تھی اور ان میں ملیالم زبان بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ دراصل یہی مالاباری مسلمان موپلہ کہلاتے تھے۔ ان

---

[1] جی آئی بوگ۔ ہندوستان کی مردم شماری-1921

میں کچھ لوگوں کو چھوڑ کر تقریباً سبھی موپلہ ہندوؤں سے مسلمان بنے تھے۔

1901ء اور 1911ء کی مردم شماری کے مطابق مالا بار میں صرف 5 سے 6 فیصد لوگوں کے پاس اپنی زمین تھی[1] ان زمینداروں میں مسلمان نہیں کے برابر تھے۔ ہندو زمینداروں میں بھی زمین کا زیادہ تر حصہ نم بودری برہمنوں کے پاس تھا۔ مالا بار کے کلکٹر مسٹر اینس کے بیان کے مطابق 1915ء میں سب سے بڑے سیاسی زمینداروں میں سبھی اونچی ذات کے ہندو خاندان تھے۔ اور ان میں صرف دو موپلہ مسلمان خاندان تھے۔ ان خاندانوں کے پاس کئی کئی ہزار ایکڑ زمین تھی اور یہ زمین کے پورے مالیانہ کا پانچواں حصہ لگان ادا کرتے تھے۔ اسی طرح 82-1881ء کے ایک جائزے کے مطابق 829 اہم زمینداروں میں 370 نم بودری' 339 نائیر' 61 راجا' 93 غیر ملیالی برہمن' 8 تیا' 4 دوسرے ہندو' ایک یورپین اور 37 موپلہ۔ موپلہ بغاوت سے سب سے زیادہ ایئرناڈ اور والوو ناڈ تعلقے متاثر ہوئے تھے اور یہاں حالت اور بھی خراب تھی۔ 292 بڑے زمینداروں میں 173 نمبودری' 96 نائیر' 20 راجا اور صرف دو موپلہ تھے۔

زمین کی اس غیر مساوی تقسیم کو جائز ٹھہرانے کے لیے نمبودری برہمنوں نے ہندو پُران میں گڑھے ہوئے ایک قصہ کا سہارا لے رکھا تھا۔ قصہ یہ ہے "بھگوان پرشورام نے یہ زمین اُن (نم بودری برہمن) کی سیر و تفریح کے لیے سمندر سے حاصل کی تھی"۔ زمین کی اس تقسیم نے جس میں 95 فیصد آبادی محروم تھی' انتہائی بے رحم اور انسان کش زرعی رشتوں کو جنم دیا۔ اس وقت کے لٹریچر اور سرکاری دستاویزات نمبودری برہمنوں کے مظالم سے بھری پڑی ہیں۔ مشہور مارکسی لیڈر ای ایم ایس نمبودری پد نے جو خود بھی نمبودری برہمن تھے' نمبودری برہمنوں کے غیر انسانی سماجی نظام پر مبنی دنیا کی بڑی دردناک تفصیل اپنی کتاب "کیرالہ کل آج اور آئندہ کل" میں پیش کی ہے۔ موپلہ مسلمان اور پسماندہ ذات کے ہندو دونوں یکساں طور پر بڑے زمینداروں اور خصوصاً نمبودری برہمنوں کی زیادتیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ اس میں صرف یہ فرق تھا کہ شودر (اچھوت) ہندوؤں نے ملک کے دوسرے حصوں کی طرح خود کو نیچ تسلیم کرتے ہوئے جانوروں جیسی زندگی گزارنا قبول کر رکھا ہے' لیکن موپلا مسلمانوں کے لیے ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ اُن کی اکثریت پسماندہ ہندوؤں کی

---

[1] کونارڈ ووڈ' موپلہ بغاوت اور اس کا آغاز صفحہ-17

تبدیلیِ مذہب کرنے والوں پر مشتمل تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ایک ایسے فلسفۂ حیات کے زیر اثر آگئے تھے' جو اپنے ماننے والوں کے درمیان برابری کے اصولوں پر عمل کرتا ہے۔

زمینداروں کے ظلم و ستم کے علاوہ زندگی میں مذہبی جوش و خروش پیدا ہونے سے بھی موپلاؤں کی مسلسل جدوجہد کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مذہب کس "مضحکہ خیز" حد تک موپلاؤں کی زندگی میں سرایت کر گیا تھا' یہ بتانے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران موپلاؤں کو یہ یقین ہو گیا کہ جرمنی نے اسلام قبول کر لیا ہے اور ترکی کی طرف سے اس کی حمایت اور جنگ میں شامل ہونے سے جنگ میں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی شکست ناگزیر ہو گئی ہے۔ موپلاؤں کو اس میں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ ترکی اور جرمنی اسلامی طاقتیں تھیں اور عیسائی طاقتوں کے خلاف ان کی فتح یقینی اور ناگزیر ہے' کیونکہ برطانیہ اور اس کے اتحادی عیسائی طاقتوں کے نمائندہ تھے۔ اس لیے یہ تحریک ان کے لیے سامراج مخالف لڑائی سے زیادہ مذہبی جنگ تھی۔ موپلہ کے لیے یہ لڑائی اس کے دین کے لیے اس کی قربانی تھی۔ موپلہ کو معلوم تھا کہ زمین کا بندوبست وہ جسے حکومت کی طاقت اور سرپرستی حاصل تھی' اس کا خاتمہ ناکامی پر ہونا ہے۔ اس لیے اس لڑائی میں شریک ہونے سے پہلے موپلہ سر پہ کفن باندھ لیتے۔ اپنی بیویوں کو طلاق دے دیتے۔ پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے غلطیوں کی معافی مانگ لیتے اور مذہبی رہنماؤں کی دعائیں حاصل کر لیتے۔ مذہبی جوش اُنھیں خودکشی کے پُر زور جذبہ سے بھر دیتا تھا[1] اسی لیے ہر بار ایک ہی جیسی تاریخ دوہرائی جاتی تھی۔ کچھ ہندوؤں کو مارنے کے بعد موپلہ کسی مسجد یا دوسری عمارت میں جمع ہو کر انگریز پلٹن کے آنے کا انتظار کرتے اور زندہ پکڑے جانے کے بجائے لڑتے ہوئے مر جانے کو ترجیح دیتے۔ 1836ء سے 1919ء تک ایسے 29 مواقع نظر آئے جن میں موپلاؤں نے اسی طرح موت کو دعوت دی تھی۔

مذہبی جوش کے سبب موپلاؤں نے اکثر مواقع پر بڑے زمینداروں اور سود خوروں کے علاوہ ایسے ہندوؤں کو بھی مار ڈالا جو نچلے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم کے شکار تھے۔ مذکورہ بالا 29 واقعات میں 82 ہندو مارے گئے۔ جن میں 78 کی ذات معلوم ہو سکی۔ ان میں سے 63 اعلیٰ ذاتوں (30 نمبودری برہمن' 6 غیر ملیالی برہمن' 34 نائیر اور دوسرے 15 شودر) نچلی ذاتوں کے ہندو شامل تھے۔

---

1 سر پرسیوال گرفتھ۔ ٹوگار ڈمائی پیوپلز :ہندوستانی پولیس کی تاریخ' صفحہ 287-

1792ء میں مالا بار پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ کے بعد زرعی قوانین مزید موپلہ مخالف ہو گئے۔ مدراس پریسیڈنسی اور مالا بار ضلع کے انگریز افسروں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ بے زمین موپلاؤں کی بہ نسبت اُن کے لیے اونچی ذات کے ہندو زمیندار زیادہ کار آمد ہیں اور حکومت کے استحکام کے لیے زمینداروں کو زیادہ مستحکم کرنا چاہیے۔ اگرچہ کچھ انگریز افسروں نے زرعی اصلاحات کی وکالت کی اور موپلاؤں کو بے دخلی سے بچانے کے لیے موثر قانون بنانے کی رائے ظاہر کی، لیکن ایسے افسر ہمیشہ اقلیت میں رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی سامراجی حکومت نے ہمیشہ ایسے قوانین بنائے، جن سے زمینداروں کی حیثیت مستحکم ہوئی اور موپلاؤں کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی۔ خاص طور سے زمینداروں کو بے دخلی کے وسیع اختیارات دے دیئے گئے اور خالی پڑی ہوئی چراگاہی زمینوں پر ان کے قبضہ کو زیادہ آسان بنا دیا گیا۔

مالا بار کے جیمنی (زمیندار) انگریز اور جاگیردار موپلاؤں کے لیے ایک جیسے دشمن تھے۔ ایک اُنھیں لوٹتا تھا اور دوسرا لوٹ کی مزاحمت کرنے والوں کو اپنی طاقت سے کچل دیتا تھا۔ موپلاؤں کے دل میں دونوں ظالموں کے خلاف غصہ اور نفرت بھری ہوئی تھی اور وہ وقتاً فوقتاً مسلح جھڑپوں سے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے تھے۔ موپلاؤں کے یہی جذبات تحریک خلافت اور کانگریس کی تحریک عدم تعاون کی حمایت کی شکل میں عملی صورت اختیار کر گئے۔

مالا بار میں کانگریس کافی دیر بعد نمودار ہوئی۔ اس کی پہلی ضلع کانفرنس پالا گھاٹ میں مئی 1916ء میں ہوئی۔ اگر ہم اُن لوگوں کے طبقاتی کردار کا تجزیہ کریں جو اس کانفرنس میں شریک ہوئے تو معلوم ہو گا کہ یہ وہی لوگ تھے جنہیں موپلہ اپنا قدیم دشمن سمجھتے تھے۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے نمائندوں میں سے 358 کے پیشے مندرجہ ذیل تھے۔ ان میں 27 فیصد زمیندار اور اُن کے کارندے، 33 فیصد وکیل اور دوسرے متوسط طبقے کے لوگ اور تاجر، مہاجن، صنعت کار، چائے اور کافی کے کاشت کار، بابو لوگ، استاد، ڈاکٹر، صحافی جیسے پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ موپلہ ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں تھے۔ کانگریس کی اس کانفرنس میں صرف دو موپلہ نمائندے شریک ہوئے اور وہ دونوں خوشحال زمیندار تھے۔

کانگریس اجلاس کے مندوبین کے طبقاتی کردار کا جائزہ لینے سے اس کے عملی پروگرام کو جاننے اور اس پر موپلاؤں کا ردّعمل معلوم ہونے میں مدد ملے گی۔ زمینداروں اور اُن

کے حامیوں سے یہ امید رکھنا فضول تھا کہ وہ زرعی اصلاحات کو اپنے ایجنڈے میں شامل کرتے۔اسی طرح موپلاؤں سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ جاگیرداروں اور وکیلوں کے ہاتھوں شروع کئے گئے پروگرام کی حمایت کریں گے۔ کیونکہ وکلاء موپلاؤں کی بے دخلی کے خلاف ان کی جدو جہد میں سب سے بڑے دشمن تھے 'جو زمینداروں کے حق میں مقدمات کی پیروی کرتے تھے۔اسی طرح درمیانہ طبقے کے وہ لوگ بھی ان کی نظر میں دشمن تھے 'کیونکہ وہ ان کے دکھ درد سے ناآشنا تھے۔ موپلاؤں نے تحریک خلافت اور کانگریس کی تحریک عدم تعاون میں شرکت تو محض اس لیے کی کہ اس طریقے سے وہ اپنی دکھ بھری زندگی پر انگریزوں کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار کر سکتے تھے۔انگریزوں نے ترکوں کو شکست دی تھی اور خلافت کی برتری کا خاتمہ کر دیا تھا۔

خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے ابتدائی دور میں ہی یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ کانگریس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی کہ 'موپلہ اپنے ایک دشمن انگریز کے خلاف تو اٹھ کھڑے ہوں لیکن دوسرے دشمن یعنی زمینداروں اور ان کے ایجنٹوں کے ساتھ دوستی کرلیں۔ موپلہ تحریک کا رخ متعین کرنے میں وہ مذہبی جذبہ بھی فیصلہ کن محرک تھا جو ایک اوسط موپلہ کے اندر موجود تھا۔اسی لیے موپلاؤں کے طرزِ عمل میں نمایاں طور پر ہندوؤں کے خلاف بیزاری اور عدم رواداری موجود تھی۔کانگریسی لیڈروں کی یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی کہ تحریک خلافت خود ہی ہندو۔مسلم اتحاد پیدا کر دے گی۔یہ تحریک انگریزوں سے زیادہ ہندوؤں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔جب پوکھٹور میں پہلی موپلہ حکومت کا اعلانیہ جاری ہوا تو اس میں واضح طور پر کہا گیا کہ تمام کافروں کو موپلہ حکومت میں سزائے موت دی جائے گی۔ تحریک کے دوران اکثر ہندوؤں کے سامنے مذہب تبدیل کرنے یا موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا گیا۔ ہندو۔مسلم اتحاد کے لیے کانگریس کی امید کتنی کمزور بنیاد پر قائم تھی 'اس کا پتہ تنور خلافت کمیٹی کے سکریٹری انومنکت پریکٹی کے نام سے جاری کئے گئے ایک نوٹس کے اقتباس سے چلتا ہے' جس کے مطابق سوراج اور عدم تعاون کے متعلق موپلاؤں کا نظریہ سمجھ میں آتا ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ "سبھی مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے سوراج حاصل کرنے کی کوشش کریں اور دوسرے مذہب کے لوگوں سے عدم تعاون کریں 'جو ہمارے مذہب کے دشمن ہیں"۔

کانگریسی لیڈروں کا یہ خیال نیک نیتی پر مبنی تھا کہ وہ تحریک خلافت میں ہندوؤں کو اور گئو رکھشا جیسی تحریک میں مسلمانوں کو شرکت پر آمادہ کر کے پائیدار اور بامعنی ہندو۔مسلم اتحاد قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن موپلا غدر اس خواہش کی ناکامی کی علامت بن گیا۔اس خیال کی بنا پر یہ حقیقت نظر انداز کر دی گئی کہ تحریک خلافت تنگ نظری پر مبنی ایک بنیاد پرست تحریک تھی' جس کے نتیجہ میں ہر جگہ مسلم فرقہ واریت میں اضافہ ہوا اور ہندو۔مسلم تعلقات میں مزید تلخی پیدا ہوئی۔ اگر کچھ مقامات پر دونوں فرقوں کے تعلقات کچھ خوشگوار نظر آئے بھی تو وہ وقتی اور سطحی ثابت ہوئے۔ ترقی پسند مسلم قیادت اس سے الگ رہی اور یہ محض ایک اتفاق نہیں کہ خود ترکی کی ترقی پسند قیادت نے بالآخر اسے دفن کر دیا۔ جن لوگوں نے موپلاؤں کو تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں شریک ہونے پر آمادہ کیا' وہ اگر یہ سوچتے تھے کہ اس سے ہندو۔ مسلم اتحاد قائم ہو جائے گا تو وہ غیر حقیقی اور خیالی دنیا میں رہتے تھے۔ یہ بات ان دونوں تحریکوں کے نتائج سے ثابت ہو جاتی ہے۔ اگر کانگریسی قیادت نے تحریک خلافت کی بجائے زرعی اصلاحات کو اپنے پروگرام کا اہم حصہ بنایا ہوتا اور موپلاؤں کو نیچی ذاتوں کے ان ہندوؤں کی اکثریت کے ساتھ شریک کر دیا ہوتا' جو زمینداروں کے ہاتھوں بدترین استحصال کا شکار تھے' تو نتائج مختلف ہوتے۔ یہ کہنا حد سے زیادہ خوش فہمی ہو گی کہ کسی معاشی مسئلے پر کوئی تحریک موپلاؤں کی زندگی سے مذہبی جنون کو ختم کر دیتی۔ لیکن یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مالابار میں زرعی اصلاحات کے لیے تحریک کا نتیجہ ایک پائیدار ہندو۔مسلم اتحاد کی صورت میں برآمد ہوتا۔ایسی جدوجہد سے حقیقی معنوں میں سامراج مخالف جدوجہد کو مدد ملتی اور پھر یہ جدوجہد قومی تحریک میں شامل ہو جاتی' تاہم کانگریس قیادت کے طبقاتی کردار کو دیکھتے ہوئے یہ توقع حد سے زیادہ ہوتی کہ یہ لیڈر زمین سے محروم موپلاؤں کو زمینداروں اور جاگیرداروں کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار کر لیتے۔

بنگال کے فسادات

بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں بنگال خصوصاً مشرقی بنگال میں مسلسل ہندو مسلم جھگڑے ہوتے رہے۔ ان جھگڑوں کے پس پردہ بھی مالابار جیسے مسائل پوشیدہ تھے۔اس کے

علاوہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مختلف تحریکوں سے مذہبی شدت پسندی کو مسلسل فروغ ملا۔ بنگال کے یہ جھگڑے اس حقیقت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ کس طرح سخت گیر مذہبی قیادت فرقہ وارانہ جنون کو بھڑکانے کے لیے سماج کے کمزور طبقوں کا مذہبی علامتوں کے ذریعے استحصال کرتی ہے۔ ایسی قیادت عام طور پر جاگیردار طبقوں کی حامی اور انھیں کے مفاد میں کام کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ اس صدی کے پہلے نصف حصے میں بنگال کے تمام فرقہ وارانہ فسادات دنیاوی مسائل کو حل کرنے کے لیے مذہبی طور طریقوں سے فرقہ واریت کا اظہار ہیں۔

1906ء اور 1946ء کے درمیان بنگال میں مندرجہ ذیل بڑے فسادات ہوئے۔ 1906-07ء میں میمن سنگھ کا فساد‘ 1918-20ء میں کلکتہ اور پبنہ اور ڈھاکہ‘ 1930ء میں کشور گنج‘ 1931ء میں چاٹگام‘ 1941ء میں ڈھاکہ اور 1946ء میں کلکتہ میں سنگین فسادات ہوئے۔ ان میں ایک بات سبھی فسادات میں یکساں طور پر موجود تھی۔ ملاؤں نے ہندو جاگیرداروں اور سود خوروں کے ہاتھوں غریب مسلمانوں کے استحصال میں مذہبی پہلو کو اُجاگر کیا اور ان کی معاشی آزادی کے لیے اسلام کو ذریعہ نجات بنانے پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کے ہجوم ہندو جاگیرداروں اور سود خوروں کو دیہات میں اور مارواڑی تاجروں کو شہروں میں ضروری اشیاء کی گرانی کے ذمہ دار سمجھتے ہوئے انھیں اپنے تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ ان فسادات میں ہندوؤں کے کمزور طبقے جیسے دودھ والے‘ دھوبی‘ صفائی کرنے والے اور مچھیرے بھی اکثر تشدد کی لپیٹ میں آجاتے تھے‘ حالاں کہ اس سے پہلے کے فسادات میں ایسے واقعات شاذونادر ہی ہوتے تھے۔ 1930ء سے 1946ء کے دوران ہونے والے فسادات میں حالات تبدیل ہوگئے۔ اب ان فسادات کو ایک علیحدہ مسلم ریاست قائم کرنے کا موثر ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ ان فسادات کے دوران سبھی ہندوؤں پر حملے ایک خاص مذہبی اور سیاسی مقصد کے تحت کئے جانے لگے۔

مذہبی رہنما بڑے شاطرانہ طریقہ سے اپنے پیروکاروں سے یہ حقیقت پوشیدہ رکھے لگے کہ ہندوؤں کے بہت کم لوگ ہی ساہوکار یا زمیندار تھے۔ میمن سنگھ کے ایک تذکرہ کے مطابق یہاں ہر سال مال گزاری کی شکل میں جمع ہونے والے 80 لاکھ روپوں کی آدھی رقم صرف ساہا‘ نواشخ اور بانک ذاتوں کے 25 آدمیوں میں تقسیم ہو جاتی۔ اسی طرح سے مارواڑی اور ساہا‘ ساہوکار قرض کے طور پر دی گئی رقم پر اکثر 25 سے 50 فیصد اور کبھی کبھار 100 فیصد رقم

بطور سود وصول کرتے۔ ان کی اس لوٹ اور استحصال کا شکار صرف مسلمان ہی نہیں ہوتے بلکہ ہندو آبادی کی بہت بڑی تعداد بھی اسی طرح ان کے استحصال کا شکار بنتی۔ مسلمانوں کی طرح سے ہندو رعیت بھی مال گزاری کے علاوہ مختلف قسم کے ٹیکس زمینداروں کو ادا کرتی۔ ان میں زمیندار یا ان کے اہل کاروں کو ہدیہ دینا بھی شامل تھا۔ زمیندار اُن سے اس وقت بھی ٹیکس وصول کرتے جب کسی اسکول میں کوئی نیا درجہ قائم کیا جاتا یا ان کے خاندان میں کسی کی شادی ہوتی یا کسی بچے کی پیدائش ہوتی۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی بھی کاشتکار یا کسان اپنا گھر بنانے' درخت کاٹنے یا تالاب کے لیے گڑھا کھودنے سے پہلے زمیندار کو خاص طرح کا ہدیہ دینے کے لیے مجبور تھا۔ کوئی بھی زمیندار کبھی کسی کسان کو زمین کا پٹہ نہیں دیتا تھا۔ کاشتکار کے پاس زمین کی کاشت کے سلسلے میں بطور ثبوت صرف وہ مال گزاری کی رسید ہوتی جو وہ زمیندار کو بطور محصول دیتا لیکن یہ رسید بھی بہت مبہم انداز کی ہوتی۔ زمیندار کو لامحدود اختیارات حاصل ہوتے اور وہ جب چاہتا کسان سے زمین خالی کرالیتا اور اس کے لیے وہ ہر طرح کے مظالم بھی کرتا۔ لیکن یہ ساری باتیں ہندوؤں پر بھی اسی طرح سے لاگو ہوتیں' جس طرح سے مسلمانوں پر۔ ہندو بھی زمینداروں کے ہاتھوں اتنے ہی پریشان ہوتے جتنے کہ مسلمان۔ اسی طرح اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی کہ انہوں نے مسلمانوں کے بہ نسبت ہندوؤں سے کبھی سود کی شرح کم لی ہو اور نہ ہی ایسی مثال ملتی کہ ہندوؤں سے واجب الاداء رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں انہوں نے کوئی رعایت برتی ہو۔ اگرچہ مسلم زمینداروں کی تعداد بہت کم تھی اس کے باوجود بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ انہوں نے اپنے مسلم کاشتکاروں کے ساتھ کسی قسم کی کوئی رعایت برتی ہو۔ وہ بھی ہندو زمینداروں کی طرح اتنے ہی ظالم تھے۔

چونکہ اس زمانے کے حالات میں عام طور پر تعلیم کی بہت زیادہ کمی تھی (1911ء کی مردم شماری کے مطابق صرف 14ء4 فیصد لوگ اور 1931ء کی مردم شماری کے مطابق صرف 5ء69 فیصد مسلمان تعلیم یافتہ تھے) اور چونکہ اس وقت کسی طرح کی سیکولرازم کی کوئی علامت بھی موجود نہیں تھی' تو یہ بنگالی مسلمانوں کے لیے فطری بات تھی کہ وہ ملاؤں کے اس جھوٹے پروپیگنڈے کا آسانی سے شکار ہو جائیں کہ 'ان کی ساری مصیبتوں' زیادتیوں اور استحصال کے لیے ہندو ہی ذمہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی غریبی اور استحصال سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار انہوں نے استحصال کے سامنے نظر آنے والی علامتوں پر حملے کرکے کیا۔ میمن

سنگھ (1906ء اور 1907ء) کلکتہ' (1918ء اور 1926ء) پٹنہ (1926ء) اور ڈھاکہ (1926ء) میں ہوئے فسادات کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ان سبھی فسادات میں ساہوکاروں کے بہی کھاتے اور زمینداروں کی زمینوں کی وہ دستاویزات لوٹی گئیں جن سے ان کے زمین کے مالک ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ شہروں میں مارواڑیوں کی جس طرح بے عزتی کی جاتی اور ان پر جس طرح سے حملے کئے گئے وہ سب اسی غصّے کا اظہار تھا۔ پہلے ہوئے فسادات میں صرف انہی مندروں پر حملہ کیا گیا تھا جن کے رکھ رکھاؤ کے لیے زمیندار رعیت سے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ اس ساری جدوجہد کو صرف طبقاتی جدوجہد کا نام دینا معاملہ کو حد سے زیادہ آسان بنا دینا ہوگا' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ملّاؤں نے احتجاج کے اس معاشی پہلو کو کم کر کے اسے مذہبی تشدد پسندی کا رنگ دے کر ایک مذہبی جنگ بنا دیا۔ مذہبی شدت پسندوں نے اس ساری جدوجہد کو مذہبی رنگ دینا شروع کیا اور اس کے نتیجے میں غریب لوگ ان فسادات کے سبب مزید نقصان میں رہے' کیونکہ انہیں ان کے لیے چندہ بھی دینا پڑتا۔ لیکن 1930ء کے بعد سے ان سارے غریب عوام کو مزید مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ کیونکہ اس وقت تک فسادات کے سیاسی فائدے کو سمجھ لیا گیا تھا اور تب یہ بہت آسان ہو گیا تھا کہ بہلا پھسلا کر غریبوں کو سڑکوں پر جمع کر کے انہیں تشدد پسند بھیڑ میں تبدیل کر دیا جائے۔

یہ مثالیں اس بات کے لیے کافی ہیں' تاکہ یہ سمجھ لیا جائے کہ کس طرح سے معاشی پہلو کو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ کر بنگال کے فساد میں استعمال کیا گیا۔ ملّاؤں نے انہیں یہ بھی تعلیم دی کہ ان کے ہم مذہب غریب لوگ دن میں 5 بار عبادت کریں' ہندوؤں سے کسی قسم کی کوئی کھانے پینے کی چیز قبول نہ کریں اور نہ ہی ہندو تہواروں کے لیے کسی قسم کا کوئی عطیہ دیں' تاوقتیکہ بحیثیت کاشتکار ان کے کاشتکاری کے فرائض میں داخل نہ ہو۔ انہوں نے یہ بھی مشتہر کیا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے گھروں میں کام نہیں کرنا چاہئے اور مسلم طوائفوں کو بھی اپنے ہندو بھائیوں کی جنسی تسکین کرنے سے انکار کرنا چاہئے۔ ان ملّاؤں نے قحبہ گری پر کبھی کوئی اعتراض وارد نہیں کیا اور نہ کبھی انہوں نے مسلم طوائفوں سے یہ کہا کہ وہ مسلمانوں کی جنسی تشنگی دور نہ کریں۔ میمن سنگھ کے فسادات میں بہت سی ایسی طوائفیں جو ہندو زمینداروں کی رکھیل تھیں' ان پر حملہ کیا گیا' ان کی جائیداد اور املاک کو لوٹا گیا اور انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں سے شادی کریں۔ اسی طرح جو مسلم خادم اپنے ہندو آقاؤں کی ملازمت چھوڑنے پر

پس و پیش کرتے' ان پر بھی حملہ کیا گیا۔

ان سارے معاشی معاملات کا فرقہ پرست سیاستدانوں نے جس طرح سے موقع بہ موقع فائدہ اٹھایا ہے' اسے ایک دوسری مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے جو بنگال لیجسلیٹیو اسمبلی میں زمینی اصلاح کے لیے پیش کئے گئے بل کے موقع پر مسلم لیگ کے رویے سے' سمجھ میں آتی ہے۔ مسلم لیگ جو یوپی میں بڑے تعلقداروں اور زمین داروں کی نمائندگی کر رہی تھی اور جس نے زمینی اصلاحات کے سبھی پروگراموں کی مخالفت کی تھی وہ اچانک بنگال میں ان زمینی اصلاحات کی حامی ہو گئی۔ کرشک پرجا پارٹی جو زیادہ تر مسلم مفادات کی نمائندگی کرتی تھی وہ بھی ان زمینی اصلاحات کی حمایتی بن گئی۔ کانگریس کے لوگ زمینی اصلاحات کی ہر کوشش کی مخالفت کرتے کیونکہ لیجسلیٹیو اسمبلی میں وہ زمینداروں کے حمایتی تھے۔ مسلم لیگ اور کرشک پرجا پارٹی نے ہر اس بات کی کوشش کی کہ ساہوکار سود کی جو شرح وصولتے ہیں اس میں کمی کرا سکیں جبکہ کانگریس کے لوگ اس کی شدید مخالفت کرتے۔ مثلاً مسلمان اخبار' غریب اور غرباء کی حمایت کرتے جبکہ ہندو اخبارات زمینداروں اور ساہوکاروں کی حمایت میں لکھتے۔ اس کے اسباب بہت واضح ہیں۔ کانگریس اور ہندو پریس زمینی اصلاحات اور سود کی شرح کو کم کرنے کی مخالفت صرف اس لیے کرتے' کیونکہ یہ ہندوؤں کے خلاف کھلم کھلا اقدامات تھے جبکہ دوسری طرف مسلم سیاسی پارٹیاں اور اخبارات جو غریب طبقہ کی حمایت کرتے وہ محسوس کرتے کہ ایسا کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے' کیونکہ بنگال کا مسلمان اس وقت معیشت کی آخر انتہا پر تھا۔

گائے کے تحفظ کی تحریک

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی اوائل میں دوران گائے محافظت تحریک اور اس کی وجہ سے بمبئی' بہار اور مشرقی یوپی میں ہونے والے خوفناک فسادات صرف اس وجہ سے ہوئے کہ اس مذہبی علامت کا استعمال بہت سے سماجی معاشی اور سیاسی مقاصد کے حصول میں کار آمد تھا' جبکہ بمبئی کے فسادات صرف صنعتی بستیوں تک محدود تھے۔ بہار اور مشرقی یوپی کے فسادات بڑے دیہی قصبوں میں بھی پھیلے۔ وہ فساد جو اعظم گڑھ 'بلیا' غازی پور' سارن' شاہ آباد' گیا اور پٹنہ کے ہزاروں مربع میل میں پھیلا' اس کی وجہ سے کئی برسوں تک انتظامیہ کا

کام کاج بُری طرح متاثر ہوا۔ کچھ انگریز افسروں کی یادداشت کے مطابق 58-1857ء کے غدر کے بعد بھوجپوری بولنے والے علاقوں میں یہ سب سے بڑا ہنگامہ تھا۔

گائے کی حفاظت کے لیے پہلی بار منظم اور مسلح کوشش کوکامیں ہوئے غدر کے دوران دیکھی گئی، لیکن اس وقت بھی یہ بہت کم علاقے تک محدود رہی۔ آریہ سماج نے ہی اس تحریک کو قومی تحریک بنایا اور اسے ہندوؤں کے وقار کی ایک علامت بنایا۔ آریہ سماج کی توسیع کے ساتھ ساتھ سارے ملک میں گئورکھشا کمیٹیاں بن گئیں۔ 1885ء میں دہلی میں گئورکھشا منڈلی بنی اور نومبر 1889ء میں بال گنگادھر تلک پونے میں اس کے سب سے بڑے رہنما بن گئے۔ بمبئی پریسیڈنسی کے گورنر ہیرس کے مطابق بمبئی میں 11/اگست 1893ء میں جو فساد ہوا وہ اسی گائے محافظت منڈلی کے ذریعہ فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے کا نتیجہ تھا۔

گاؤکشی کے خلاف جو تحریک سارے مشرقی یوپی میں 88-1878ء کے دوران پھیلی اس کے بیج الہ آباد میونسپل بورڈ کے اس فیصلے میں ملتے ہیں، جس میں اس نے شہر میں گاؤکشی پر پابندی لگانے کے لیے اپنے بائی لاز میں تبدیلی کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلہ کو بعد میں الہ آباد ہائی کورٹ نے قانونی منظوری دینے سے اس لئے انکار کر دیا کیونکہ اس طرح سے مذہبی عقیدے کو قانونی رنگ مل جاتا۔ اس کے نتیجہ میں گائے محافظ سوسائٹیاں بہت سے شہروں میں قائم ہوگئیں۔ بڑی حیرت ناک عجلت اور غیر معمولی تنظیمی لیاقت کے ساتھ یہ تحریک مشرقی یوپی اور بہار کے بھوجپوری بولنے والے دیہی علاقوں میں پھیل گئی اور بڑے پیانے پر مسلمانوں کی زندگیاں اور ان کی املاک ان علاقوں میں تاراج کی گئیں۔

ایسا نہیں ہے کہ صرف گائے کی حفاظت ہی کا خیال اس گائے محافظ تحریک کا سبب بنا بلکہ اکثر و بیشتر ان کے پیچھے بہت سے ذاتی مفاد بھی کام کرتے رہے۔ یہ یاد رکھنے والی بات ہے کہ اس طرح کی تحریکوں کی نمائندگی ہمیشہ گاؤں کے بڑے زمیندار کرتے تھے۔ مشرقی یوپی اور بہار کے بھوجپوری بولنے والے علاقوں میں بیشتر زمیندار بھومی ہار، چھتری اور برہمن ہوا کرتے تھے اور ان علاقوں میں اس تحریک نے موثر رول ادا کیا۔ دربھنگہ کے راجہ اور ان کے عزیز لال چھترپتی سنگھ یا لوشی اپادھیائے اس زمیندار طبقہ کی نمائندگی کی مثالیں ہیں۔

اس تحریک کا مطالعہ کرنے کے بعد دو بہت دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس تحریک کے پیچھے غیر مذہبی مفادات کس طرح سے کام کر رہے تھے۔

بھوجپوری علاقے میں ایسے بہت سے واقعات ہوئے جب زمینداروں نے اپنے مسلم کاشتکاروں کو بے دخل کرنے کے لیے صرف یہ الزام لگایا کہ انہوں نے گایوں کو ذبح کیا ہے۔ یہ ایک بہانہ ہندو زمینداروں کو مل جاتا' تاکہ وہ پریشان کرنے والے اپنے مسلم کاشتکاروں کو آسانی سے بے دخل کر دیں۔ اکثر و بیشتر اگر کوئی مسلم کاشتکار مال گزاری کی بڑھی ہوئی رقم دینے سے انکار کرتا یا اس کی بقایا رقم دینے میں حیل و حجت سے کام لیتا تو اس کے خلاف فوراً گائے ذبح کرنے کا الزام لگا دیا جاتا۔ بہت سے معاملات میں ہندو اور مسلم زمینداروں کی معاشی حسد اور رقابت کو لے کر مسلمان زمینداروں پر اس طرح کے الزامات عائد کئے جاتے کہ وہ گئوکشی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ان سارے معاملات میں کام کرنے کا ایک ہی جیسا طریقہ ہوتا کہ ہندو اکثریت کے جذبات کو بھڑکا دیا جائے اور اسے مسلم کاشتکار یا رقیب مسلم زمیندار کے خلاف موڑ دیا جائے۔

دوسری طرف نچلی ذات کے ہندوؤں میں یہ خیال کہ وہ مذہبی معاملات میں شرکت کر کے اپنے سماجی رتبہ کو بڑھا سکتے ہیں' کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ خاص طور پر کوئری' اہیر اور کرمی ذات کے لوگوں نے جنیو پہننا شروع کیا' اپنے نام کے آگے سنگھ اور رائے لکھنا شروع کر دیا اور اس 'مذہبی' کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تاکہ ذات پات میں تقسیم ہندو سماج میں وہ اپنا سماجی مرتبہ بلند کر سکیں' لیکن اس کا ایک تفریحی پہلو بھی ہے کہ ان کی اس کوشش کی مخالفت مظفر نگر' پٹنہ اور دربھنگہ کے مسلمان اور ہندو زمیندار دونوں مل کر کرتے اور بہت سے موقعوں پر ان پچھڑی ذات کے لوگوں کو دونوں کے ظلم اور زیادتی کا شکار ہونا پڑتا۔ یہ بات اپنے آپ میں بہت دلچسپ ہے کہ وہ لوگ جو سماجی برابری اور اپنی عزت کے لیے کوشاں تھے' ان کا استعمال فرقہ وارانہ کاموں کے لیے تو ضرور کیا جاتا' لیکن ان کا استعمال کرنے کے بعد انہیں ہمیشہ برابری کا درجہ دینے یا ان کی سماجی مرتبت کو بلند کرنے کی ہر کوشش کو ناکام کر دیا جاتا۔

○○

باب سوم

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی نفسیاتی اور سماجی توضیحات

(الف)

فرقہ وارانہ تشدد کو جائز قرار دینے کے لیے ہر فرقہ اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔ یہ دلائل اس فرقے کے افراد کی ذہنیت میں اتنے گہرے پیوست ہوتے ہیں کہ وہ اکثر انہیں اپنی تہذیبی شناخت کے ایک حصہ کے طور پر تسلیم کرنے لگتے ہیں۔ ان ہی دلائل کی بنیاد پر وہ دوسرے فرقوں سے تعصب کرنے لگتے ہیں۔ خود کو امن کا پسند، بُردبار، تحمل پسند ماننا اور دوسرے فرقے کو اکثر ظالم، کٹر اور ناقابل اعتماد کی شکل میں دیکھنا ایسی غلط فہمیاں ہیں، جنھیں عام طور پر سبھی فرقے اپنی سوچ کے اٹوٹ حصے کے طور پر قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ان پر کسی بحث سے پرہیز کرتے ہیں۔ اکثر کسی فرقے کا برتاؤ ایسا ہو جاتا ہے، جس کی کوئی صفائی نہیں دی جاسکتی۔ اپنے کرتوت کو جائز قرار دینے کے لیے یہ فرقہ دوسرے فرقے کے برتاؤ میں ایسے

اسباب تلاش کرنے لگتا ہے، جن سے اس کا برتاؤ تنقید کے دائرے سے باہر آسکے۔ مثال کے طور پر صرف فرقہ پرست طاقتیں ہی اپنے فرقے کو تشدد پر اکسانے کے لیے دوسرے فرقے کے مظالم مبالغہ آرائی سے بیان نہیں کرتیں بلکہ اُمید کے برخلاف میانہ رو سمجھدار طبقہ بھی اسی دلیل سے اپنے فرقے کے تشدد کو صحیح ثابت کرنے لگتا ہے۔[1] اکثر اپنے فرقے کے بھولے پن اور امن پسندی کی دلیل اتنی مضحکہ خیز سنجیدگی سے رکھی جاتی ہے کہ اسے تسلیم کرنے کا مطلب ساری انسانی کمزوریوں اور مسلمہ برتاؤ سے منکر ہو جاتا ہے۔ اس دلیل کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ایک فرقہ ہر حالت میں امن پسند اور انصاف پسند رہتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ کیا گیا تشدد محض اپنے دفاع میں اختیار کیا گیا ردِّ عمل ہوتا ہے۔[2]

فرقہ وارانہ فساد سڑکوں سے پہلے دل ودماغ کی سطح پر ہوتے ہیں۔ کسی فرقے کو بڑے پیمانے پر تشدد میں جھونکنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ اس کے سامنے کچھ ایسے اسباب رکھے جائیں جو نہ صرف اس کے تشدد کو جائز ٹھہرائیں، بلکہ اس فرقے کی نفسیات کو ایسے نقطۂ عروج پر پہنچائیں جہاں تشدد میں شریک نہ ہونا، اس کے لیے بزدلی سے بڑھ کر قوم دشمنی تصور کیا جائے، یہ سوچ کئی سطحوں پر فروغ پاتی ہے۔[3]

ہندوستانی تناظر میں اس کوشش کو مسلم اور ہندو فرقہ پرست طاقتوں کے بڑے منصوبوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے بڑے طبقہ تک یہ پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ برصغیر کے مسلمان، اپنی الگ الگ تہذیبی وراثتوں، زبان، غذا یا پوشاک سے متعلق اختلافات اور جغرافیائی فاصلوں کے باوجود اس لیے ایک قوم ہیں کہ وہ ایک ہی مذہب یعنی اسلام میں یقین رکھتے ہیں۔ مسلم لیگ کی اس

---

1. اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں کے وسیع پیمانے پر قتلِ عام سے قبل تقریباً ہر شہر میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ سکھوں نے اندرا گاندھی کے قتل کے بعد مٹھائی تقسیم کی، جس سے مشتعل ہو کر ہندوؤں نے انھیں مارا۔ یہ افواہ کہیں بھی صحیح نہیں پائی گئی۔

2. 1946ء میں بہار میں 30,000 مسلمانوں (غیر سرکاری اندازہ 40-50,000) کے قتل کو نواکھالی میں مسلمانوں کے ذریعہ ہندوؤں کے قتلِ عام کا سبب بتایا گیا۔ نواکھالی میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 139 (غیر سرکاری اندازہ 200) ہندو مارے گئے۔

3. پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے ذریعہ "اے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ" جلد دوم میں شریف المجاہد کے مضمون Communal Riots کے مطابق ہندوستان کے فرقہ وارانہ فساد ہندوؤں کی بربریت اور مسلمانوں کی امن پسندی کی مثال ہیں۔

سوچ میں مسلمانوں کی اکثریت نے نہ صرف یقین کیا[1]' بلکہ مسلم ملک حاصل کرنے کے لیے جدوجہد بھی کی۔ مذہب پر مبنی ملک کی سوچ کتنی کھوکھلی تھی' اس کا پتہ 1971ء میں بنگلہ دیش کے الگ ملک بن جانے سے چل گیا ہے۔ اسی طرح 'ہندوتو" کی طاقتوں نے پچھلی کچھ دہائیوں میں ملک کے قومی دھارے کا سوال اُٹھایا ہے۔ یہ طاقتیں چاہتی ہیں کہ مسلمان ملک کے اس قومی دھارے میں شریک ہو جائیں۔ لیکن ملک کی یہ مخصوص دھارا ہے کیا۔؟ اس سوال کا کوئی ٹھوس جواب ان طاقتوں کے پاس نہیں ہے۔ اگر ملک کی یہ خاص دھارا' ہندو دھارا ہے تو کون سی 'ہندو دھارا' خاص دھارا بنے گی؟ برہمن ہندو دھارا یا شودر ہندو دھارا' ملیالی ہندو دھارا یا پنجابی ہندو دھارا۔ ایک کثیر مذہبی سماج میں جس قدر تضادات ہو سکتے ہیں ' وہ سبھی ہندو اور ہندوستانی سماج میں موجود ہیں اور اکثر یہ تضادات نہ صرف ناچاقی بلکہ تصادم کے محور کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ہندوتوادی طاقتوں کا یہ نعرہ "جو ہندو مفاد کی بات کرے گا' وہی ملک پر راج کرے گا" اس خیال کو ہندوؤں کے دل میں بٹھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ہندو ہونے کے سبب ان کے مفادات بھی ایک ہیں اور اسی بنیاد پر انہیں انتخابات میں ایک ساتھ ووٹ دینا چاہیے۔

تشدد کی نفسیات کی ایک اپنی مکمل دلیل ہوتی ہے' جو زمانے کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ عہد وسطیٰ میں مذہب زندگی میں زیادہ فیصلہ کن انداز میں مداخلت کر سکتا تھا' اس لیے اُس دور کا تشدد بھی مذہبی علامتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ عیسائی اور مسلم دنیا کے درمیان چلنے والی مذہبی جنگ یا جہاد اور ہندوستانی پس منظر میں برہمن - بودھ تشدد' یا شیو - ویشنو لڑائی مذہبی تشدد کی مثالیں ہیں۔ اس تشدد میں مخالفین کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنا یا جبراً تبدیلیٔ مذہب کرانا شامل ہوتا تھا۔ اس تشدد کے پیچھے مذہبی فرائض کا جذبہ کارفرما رہتا تھا۔ اس فرض کی ادائیگی میں شامل لوگوں کو موت کے بعد جنت میں جانے کا پختہ یقین ہوتا تھا۔ قبائلی یا جاگیردارانہ نظام میں شناخت اور تحفظ کا بحران اتنا زبردست نہیں تھا' جتنا وقت کی تبدیلی کے ساتھ پیداوار کے وسائل کے سرمایہ دارانہ فروغ کے دور میں بن گیا ہے۔ پیداواری رشتوں میں آئے فرق نے سماج میں اندرونی توازن کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ مذہب اب صرف اپنی مجموعی شکل میں انسانی مسائل کے حل نہیں پیش کر سکتا۔ سائنس اور مختلف نظریات کے درمیان ہونے والے آپسی لین دین کے سبب فروغ پانے والے انسانی شعور کے نتیجے میں

---

[1] 1946ء کے انتخابی نتائج

مذہبی جنگوں جیسے تشدد والی عہد وسطیٰ کی سوچ کو سماجی قبولیت ملنا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمعصر دنیا میں مذہب کے نام پر مضبوط ذہنیت پان اسلام ازم (Pan Islamism) بھی اپنے پیروکاروں کی بڑی تعداد کو جہاد کے نام پر متحرک نہیں کرپائی۔ افغانستان، کشمیر یا بوسنیا۔ ہرزیگونیا میں 'اسلام خطرے میں ہے' کا نعرہ مسلم حکومتوں اور ان کے عوام کو اس حد تک متحرک نہیں کرپایا ہے، جتنا عہد وسطیٰ میں ایسا کوئی موضوع کرپاتا۔

ہمعصر دنیا میں تشدد نے خالص مذہبی بنیادوں کے علاوہ مادی اسباب تلاش کرلئے ہیں۔ ان اسباب کی مذہبی توضیحات ضرور ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ مادی ہیں۔ سماج میں سینکڑوں برسوں سے جاری سماجی رشتوں کے درمیان موجودہ توازن کو بگاڑنے میں سب سے بڑا ہاتھ دو طاقتوں کا ہے۔ یعنی پیداوار کے طریقوں میں آئی تبدیلی اور جمہوریت۔ پیداوار کے سرمایہ دارانہ طریقوں نے شہروں کے فروغ، نقل و حمل کے جدید اور تیز وسائل کی فراہمی، تعلیم کا پھیلاؤ اور مرد۔ عورت کی برابری جیسے اداروں کی تشکیل میں تعاون تو دیا، لیکن دنیا نے اس کا دوسرا خطرناک رُخ بھی دیکھا، جو سامراج، جنگ و استحصال اور نابرابری پر مشتمل معاشرتی نظام کی صورت میں سامنے آیا۔ ان تبدیلیوں نے فطری طور پر ایسی کشیدگی کو جنم دیا جس سے دنیا پہلے واقف نہیں تھی۔ سماج کے امیر طبقوں کے لیے اب سب سے زیادہ محروم، استحصال زدہ اور پریشان حال آبادی کو یہ سمجھانا مشکل ہو گیا ہے کہ ان کی مصیبتوں کے اسباب اُخروی ہیں۔ ایشور، قسمت، دوسرا جنم یا جنت، جہنم جیسے غیر مجسم نظریات سے کہیں زیادہ لوگ اب اپنے مسائل کے دنیاوی اسباب جاننا اور ان کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ادارے کی شکل میں جمہوریت بھی ان طاقتوں کے سامنے بڑا چیلنج بنی ہوئی ہے، جو سماجی عدم مساوات کی مذہبی تشریح پیش کر کے اُسے جائز ٹھہرانا چاہتی ہے۔ فطری طور پر اس چیلنج نے سینکڑوں برسوں سے چلے آرہے رشتوں کے سماجی توازن کو خلط ملط کر دیا ہے۔ دراصل موجودہ دنیا میں فرقہ پرستی حکمراں طبقہ کے ذریعہ اپنی خاص سماجی برتری کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنائی جانے والی سب سے موثر دست اندازی ہے۔ حکمراں طبقے، محروم طبقوں کے سامنے ان کے دنیاوی مسائل کے لیے کچھ ایسے پُر فریب حل پیش کرتے ہیں، جن سے محروم طبقے، طاقتور طبقوں کے خلاف منظم ہونے کے بجائے آپس ہی میں لڑتے مرتے رہیں۔

مادّی علامتوں سے پیدا ہونے والی کشیدگی میں اضافہ ہندوستانی سماج میں انگریزوں

کی آمد کے بعد سے شروع ہوا۔ یہ کشیدگی مسلم دور حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پہلے سے موجود مذہبی کشیدگی سے قطعی مختلف تھی۔ خاص طور پر زراعت اور دستکاری پر مبنی ایک جاگیردارانہ سماج کے صنعتی سرمایہ دارانہ سماج میں بتدریج منتقل ہونے کے نتیجے میں یہ کشیدگی فطری بات تھی۔ انگریزی تعلیم سے مخالفت کی حد تک بیزاری کے سبب مسلمان فطری طور پر نوکریوں میں پچھڑتے چلے گئے۔ بالغ حق رائے دہندگی کی بنیاد پر اگر انتخاب ہوتے تو یہ طے تھا کہ ہندوؤں کے مقابلے مسلمانوں کی اقتدار میں شرکت 'ان کی آبادی کے تناسب سے کم ہوتی۔ ان دونوں حالتوں کا فائدہ ملاّ۔ تعلقہ دار اتحاد نے اٹھایا۔ مسلم قیادت نے مسلم فرقے کو یہ باور کرادیا کہ ان مسائل کا حل اپنے تشخص کو محفوظ رکھنے میں ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ آزادی سے پہلے ہندو اور مسلمان دونوں میں فرقہ پرست طاقتوں کی قیادت جاگیردارانہ عناصر نے کی۔ ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کی قیادت خاص طور پر زمینداروں' تعلقہ داروں اور اعلیٰ ذاتوں کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ عناصر اپنے طبقے کے مفادات کے لیے فرقہ پرستی بڑھانے میں سرگرم رہتے تھے۔ فسادات 'ان کے پاس سب سے بڑے ہتھیار کے طور پر موجود تھے' جن کا بھرپور استعمال انھوں نے ہندو۔مسلم عوام کے درمیان انتشار پیدا کرنے کے لیے کیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے جاری رہنے کے پیچھے کسی ایک سبب کو ذمہ دار نہیں مانا جاسکتا۔ جدید ہندوستان کی حکومت کا کردار' ملک میں معاشی فروغ اور مختلف سماجی تنظیموں پر اس کے اثرات 'انتخابات کے تعلق سے سیاسی جماعتوں کا رویہ' ملک میں منظم مافیاؤں کا عروج جیسے بہت سے عوامل ہیں' جو وقتاً فوقتاً فرقہ وارانہ فسادات کے اسباب کی شکل میں ابھر کر سامنے آتے رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے پیچھے یہ سارے اسباب الگ الگ یا کئی مرتبہ ایک ساتھ سرگرم رہتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں متوسط ہندو طبقہ سب سے زیادہ فرقہ پرست ہوا ہے۔ اس کی وجہ ہندوتو کا نعرہ دینے والی طاقتوں کے ذریعہ رام جنم بھومی مندر کے لیے بڑے منظم طریقے سے چلائی جانے والی تحریک ہے۔ آزادی کے بعد کسی ایک موضوع پر ہندوؤں میں بڑے پیمانے پر فرقہ پرستی کا فروغ اور اپنی خوفناکی اور تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ فسادات اسی تحریک کی دین ہیں۔ حکومت اس پوری تحریک کے خلاف مضبوط اور طاقتور مزاحمت کھڑی نہیں کرسکی۔ یہ اسی تحریک کا نتیجہ ہے کہ پچھلے دنوں کئی

درجن ایسے شہروں، قصبوں اور گاؤوں میں فسادات ہوئے جہاں اس طرح کے فسادات کی کوئی تاریخ موجود نہیں تھی اور جو تقسیم ملک کے بدترین دور بھی ایسے فسادات سے محفوظ رہے تھے۔

(ب)

فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں اکثریتی فرقے کی سوچ دو قسم کے نظریات پر مبنی ہے:

(1) اکثریتی فرقہ یا ہندو یہ مانتا ہے کہ فساد مسلمان شروع کرتے ہیں اور ان میں مرنے والوں کی تعداد بیشتر ہندوؤں کی ہوتی ہے۔اس یقین کے پیچھے کچھ ایسے نظریات ہیں جو ہندو عوام کی نفسیات میں بہت گہرائی تک پیوست ہیں۔

(2) متوسط ہندو یہ مانتا ہے کہ مسلمان فطرتاً ظالم، تشدد پسند، بے وفا اور جنونی ہوتا ہے جبکہ ہندو فطرتاً معتدل، خداترس، متحمل اور امن پسند ہوتا ہے۔ایک بار ان دونوں نظریات کو اپنی نفسیات کا آسان حصہ بنالینے کے بعد یہ بہت فطری ہوجاتا ہے کہ ہندوؤں کا بڑا طبقہ یہ تسلیم کرے کہ فساد مسلمان شروع کرتے ہیں اور اس میں ہندو زیادہ مرتے ہیں۔ایک 'ظالم اور متشدد' سماج کے ذریعہ فساد شروع کرنے کا نظریہ انہیں کسی بھی طرح غیر فطری نہیں لگتا۔ اسی طرح فسادات میں ''فطری طور پر امن پسند اور معتدل'' فرقہ کا زیادہ نقصان ہونا بھی آسانی سے قابل قبول ہوجاتا ہے۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اکثریتی فرقے کے دل ودماغ میں پیوست ان دونوں نظریات کو تفصیل سے سمجھنا دلچسپ ہوگا۔

عام طور سے فساد شروع کون کرتا ہے۔ مسلمان یا ہندو؟ یہ ایک بحث طلب موضوع ہوسکتا ہے، کیونکہ ایک ہی حقیقت کو الگ الگ اور کئی بار متضاد معنوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔فساد کی شروعات کے بارے میں بحث کی گنجائش ہے لیکن مرنے والوں کی تعداد کے بارے میں قطعی نہیں۔اس لیے مناسب یہی ہوگا کہ پہلے مرنے والوں کی تعداد سے متعلق نظریے کی جانچ کی جائے۔ صرف سرکاری اعداد وشمار پر یقین کیا جائے تب بھی مرنے والوں میں نہ صرف مسلمانوں کی تعداد ہر فساد میں زیادہ ہوتی ہے، بلکہ آدھے سے زیادہ فسادات میں تو یہ تعداد 90 فیصد سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ہندوستان میں سرکاری اعداد

وشمار کی معتبریت کو اکثر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن اقلیتوں کے معاملے میں دنیا کی کوئی حکومت ایسے جھوٹے اعداد وشمار پیش نہیں کرنا چاہے گی، جن سے یہ محسوس ہو کہ اس کے ملک میں اقلیتیں محفوظ نہیں ہیں۔

مندرجہ ذیل جدول پر ایک نظر ڈالنے سے مرنے والوں کے تعلق سے ہندوؤں میں پھیلی غلط فہمی کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

سال	فرقہ وارانہ فسادات کی تعداد	مرنے والوں کی تعداد		کُل
		ہندو	مسلمان	
1968	346	24	99	133
1969	519	66	558	674
1970	521	68	176	298
1971	321	38	65	103
1972	210	21	45	70
1973	242	26	45	72
1974	248	26	61	87
1975	205	11	22	33
1976	169	20	19	39
1977	188	12	24	36
1978	219	51	56	108
1979	304	80	150	261
1980	427	87	278	375
میزان	**3949**	**530**	**1598**	**2289**

ذریعہ : لاء اینڈ آڈر : مطالعات اور کیسز؛

ناشر : لال بہادر شاستری نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن، مسوری۔

یہ اعداد و شمار وقتاً فوقتاً وزارت داخلہ کی طرف سے جاری کردہ رپورٹوں سے لیے گئے ہیں۔ کئی برسوں میں ہلاک شدگان کی کل تعداد ہندو مہلوکین اور مسلم مہلوکین کی تعداد کے جوڑ سے زیادہ اس لیے ہے کہ ان میں پولیس والوں، دوسرے مذاہب کے لوگوں اور ایسے مہلوکین کی تعداد بھی شامل ہے جن کی شناخت نہیں ہو سکی۔

ان اعداد و شمار کے علاوہ 1960ء کے بعد کے کچھ بڑے فرقہ وارانہ فسادات میں مہلوکین میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ تعداد پر مندر ذیل جدول میں نظر ڈالنا بھی مناسب ہوگا۔

	مرنے والوں کی تعداد			
مقام	ہندو	مسلم	دیگر جن کی شناخت نہیں ہوئی	کل
علی گڑھ (1961)	1	12	-	13
رانچی / ہٹیا (اگست 1967)	20	156	1	177
احمد آباد (ستمبر 1969)	24	430	58	512
بھیونڈی (مئی 1970)	17	59	2	78
جلگاؤں (مئی 1970)	1	42	-	43
فیروز آباد (1972)	3	16	2	21
علی گڑھ (1979)	6	19	3	28
مراد آباد (اگست، ستمبر 1980)	18	142	0	166
میرٹھ (اکتوبر 1982 تک)	6	21	2	29
میزان	**96**	**897**	**74**	**1067**

دونوں فہرستوں سے یہ واضح ہے کہ آزادی کے بعد تقریباً سبھی فسادات میں کچھ ناقابل ذکر مثالوں کو چھوڑ دیں تو مہلوکین میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ ہے بلکہ بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ فسادات کے دوران اور اس کے بعد پولیس

کارروائی بھی خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف ہی کی جاتی ہے۔اس مطالعے کے تیسرے باب میں ہم دیکھیں گے کہ ان فسادات میں بھی، جن میں صرف مسلمان ہلاک ہوئے پولیس نے گرفتاریاں بھی خاص طور پر انہی لوگوں کی کیں، تلاشیاں بھی بیشتر انہیں کے گھروں میں ہوئیں اور کرفیو کا ستم بھی انہیں کو سہنا پڑا۔ یہ حقائق کسی طرح سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ خاص طور پر سیکولر ذرائع ابلاغ اور اردو اخبارات ہر فساد کے بعد مسلمانوں کے ساتھ ہوئی زیادتی کی خبریں شائع کرتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ خبریں مبالغہ آرائی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا بنیادی پیغام تو مسلمانوں تک پہنچ ہی جاتا ہے کہ اگر فساد ہوگا تو اس میں مسلمان ہی خاص طور پر مارے جائیں گے۔ انہیں کے گھروں کی تلاشیاں ہوں گی اور انہیں ہی گرفتار کیا جائے گا۔اس کے بعد بھی اگر یہ مانا جاتا ہے کہ مسلمان ہی فساد شروع کرتے ہیں تو اس نظریے کی چھان بین ضروری ہے کیونکہ یہ دلائل سے میل نہیں کھاتا۔ سب سے پہلے تو یہی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس نظریے میں کہیں نہ کہیں کوئی بنیادی غلطی موجود ہے۔ کوئی بھی فرقہ، جب تک اس میں اجتماعی خودکشی کا رجحان موجود نہ ہو یا وہ پوری طرح پاگل نہ ہو، اپنے نقصان کا یقینی طور پر علم ہونے کے باوجود فساد کیوں شروع کرے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک خوفزدہ فرقہ پہلے ہاتھ اُٹھا کر پورے نظام کے تئیں اپنے غصے اور بے اعتمادی کا اظہار کر رہا ہو۔؟اس کے ساتھ ہی ہمیں فسادات کی شروعات کے بارے میں بھی یہ طے کرنا ہوگا کہ کیا کسی فساد کی شروعات حقیقت میں صرف اُسی وقت سے مانی جانی چاہئے، جب سے وہ بظاہر شروع ہوا۔؟

(ج)

اگر ہم کسی فساد کے تشدد کا عمرانیاتی نقطۂ نظر سے تجزیہ کریں تو پائیں گے کہ وہ تشدد کسی مخروطی کی شکل میں پھیلتا ہے اور کشیدگی اور تصادم مختلف شکلوں میں پہلے سے ہی سماجی ڈھانچے میں موجود ہوتی ہے۔ ایک بڑے فرقہ وارانہ تشدد کی تیاری کافی پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ تصادم کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی کشیدگی ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہے، جہاں ایک پتھر یا ایک افواہ تشدد شروع کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ کشیدگی کے مخروطی شکل میں آہستہ آہستہ اوپر بڑھتے جانے اور ایک ایسے نقطے تک پہنچنے کے پیچھے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، جہاں چھوٹی سی

بات بھی تشدد شروع کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ہندو یا مسلمان تاجروں میں معاشی مقابلہ آرائی، زمین مافیا کی کسی زمین پر لگی ہوئی نظریں، مستقبل قریب میں ہونے والا الیکشن، ایسے اسباب ہیں، جن کے باعث کوئی بھی بااثر گروہ کشیدگی کے نقطوں کو اکساتا رہتا ہے اور کسی علاقے کو تیاری کی ایسی حالت میں رکھتا ہے، جہاں چھوٹی سی بات بھی بڑے تشدد کی وجہ بن جاتی ہے۔ کئی بار یہ سبب کشیدگی سے لبریز پورے پس منظر میں کہیں بھی موزوں نہیں بیٹھتا۔ یہ ممکن ہے کہ کشیدگی کی خاص وجہ کوئی عبادت گاہ ہو، لیکن فساد ایک مسلمان اور ایک ہندو سائیکل سوار کے آپس میں ٹکرا جانے سے شروع ہوا ہو۔ لیکن کسی ایسے معمولی واقعہ سے بڑے پیمانے پر تشدد تب ہی شروع ہو سکتا ہے جب کشیدگی پہلے سے ہی وافر مقدار میں بارود کی طرح جمع ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جیسے واقعات پر الگ الگ علاقوں میں الگ الگ ردّ عمل ہوتے ہیں۔ مثلاً ہندو اور مسلمان سائیکل سواروں کے آپس میں ٹکرانے سے ہر وقت فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوگا۔

بھیونڈی، جلگاؤں اور مہاڑ میں مئی 1970ء کے فرقہ وارانہ فسادات کی جانچ کرنے والے جسٹس ڈی پی مدان نے کسی فساد کی شروعات کے نظریے کا تجزیہ بڑے معقول انداز سے کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ".....اگر ہمیں کسی فساد سے متعلق حقائق کے بارے میں صرف سطحی رائے قائم کرنی ہے تو ہمیشہ محسوس ہوگا کہ فساد کسی ایسے معمولی واقعے سے شروع ہوا تھا جس پر ہم تعجب کرتے رہ جائیں گے کہ کیسے اتنی چھوٹی سی بات، اتنے بڑے پیمانے پر آگ زنی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی وجہ بن گئی۔ حالانکہ اسے سمجھنے کے لیے زیادہ سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ واقعہ فساد کا اصلی سبب نہیں تھا، بلکہ فساد تو کسی دوسرے سبب سے ظہور پذیر ہوا تھا۔"

پچھلے کچھ برسوں میں ہونے والے فسادات کے دوران پتھر پھینکے جانے اور کشیدگی پیدا ہونے کے عمل کے مابین رشتوں کو سمجھنے کے لیے آزادی کے بعد رونما ہوئے کچھ فسادات کے مرحلہ وار واقعات کو دیکھنا مناسب ہوگا۔

رانچی فسادات — 1967ء

22/اگست 1967ء کو رانچی میں دوپہر تقریباً ساڑھے تین بجے فساد شروع ہوا۔

ظاہری سبب بڑا معمولی تھا۔ اردو کی مخالفت میں نکلے ہندو طلباء کے جلوس پر مسلمانوں کے پتھراؤ سے فساد شروع ہوا۔ اگر ہم 22/اگست سے پہلے کے دس دنوں کے سلسلۂ واقعات' اس دن جلوس کے ذریعہ لگائے گئے نعرے اور منتشر ہونے کے بعد جلوس میں شریک لوگوں کا برتاؤ دیکھیں تو اصل صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔

1967ء کے انتخاب کے بعد بہار میں مخلوط حکومت بنی' جس میں جن سنگھ بھی ایک معاون جماعت تھی۔ متحدہ حکومت نے' جس میں سبھی غیر کانگریسی پارٹیاں شریک تھیں' ایک 33 نکاتی منشور جاری کیا تھا جس میں اُردو کو بہار کی دوسری زبان بنانے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔ سرکار میں شریک جن سنگھ اس پروگرام سے متفق نہیں تھی۔ 14/جولائی 1967ء کو جب اسمبلی میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا ایک غیر سرکاری بل پیش ہوا تو جن سنگھ' کانگریس کے کچھ ممبران اور ہندی ساہتیہ سمیلن جیسی غیر سرکاری تنظیموں نے اس کے خلاف ریاستی سطح پر احتجاجی تحریک کا اعلان کر دیا۔ پوری ریاست میں 12 سے 26/اگست تک اُردو مخالف پندرھواڑہ منانے کا اعلان کیا گیا۔ رانچی میں 12/اگست سے اُردو کی مخالفت میں مختلف پروگرام شروع ہوئے۔ ان میں اُردو کی مخالفت میں پرچے تقسیم کرنا اور اشتعال انگیز نعروں کے ساتھ جلوس نکالنا شامل تھا۔ پرچے بہت ہی اشتعال انگیز اور جارحانہ زبان میں تھے اور ان میں اردو و مسلمانوں کے خلاف قابل اعتراض طریقہ سے دلیلیں دی گئی تھیں۔ "نئی نسل کی مردانگی کے لیے چیلنج" نامی پرچے میں کھلے عام مسلمانوں کو غدارِ وطن کہتے ہوئے ہندوؤں کی نئی نسل کو ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کے لیے اکسایا گیا تھا۔ 16/اگست کو اُردو کی مخالفت میں ایک جلوس نکالا گیا' جس میں کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں۔ اس دور کے اخبارات کو دیکھا جائے تو رانچی میں روز بہ روز بڑھ رہے اشتعال کا پتہ چلتا ہے۔ اشتعال کے بڑھتے دور میں فطری طور سے مسلمانوں نے اپنی حفاظت کی کوشش شروع کر دی۔ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ اُردو کی مخالفت میں نکالے گئے جلوس ان کی آبادی اور جائیداد پر حملے کر سکتے ہیں۔

بعد کے واقعات سے ان کا یہ ڈر صحیح بھی نکلا۔ 22/اگست کو نکالے گئے جلوس کا ہجوم منتشر ہو کر جب شہر سے گذرا تو اس نے تباہی مچادی۔ 22/اگست سے 26/اگست کے دوران 184 لوگ مارے گئے' جن میں 164 مسلمان تھے۔ اتنے بڑے پیمانے پر تشدد صرف اُس پتھراؤ سے نہیں ہو سکتا تھا' جو مبینہ طور سے مسلمانوں نے منتشر ہوتے جلوس پر سنٹرل اسٹریٹ'

ہند پیڑھی اور کونکا روڈ پر کیا تھا۔ اس کے پہلے ' دس دنوں سے رانچی کی سڑکوں پر نعرے لگ رہے تھے کہ "اگر اُردو لادی لڑکوں پر تو خون بہے گا سڑکوں پر"۔ مسلمانوں کا پتھراؤ ایک ایسے ڈرے ہوئے فرقے کا ردِّ عمل زیادہ تھا' جسے پچھلے دس دنوں سے اپنے اوپر حملے کا خوف تھا۔ 22/ اگست کو واپس لوٹتے ہوئے جلوس کے فسادیوں کی ایک حملہ آور شناخت اگر انہوں نے اپنے دماغ میں بنائی اور پہلے پتھر پھینک دیا تو یہ ایک خوفزدہ فرقہ کا فطری ردِّ عمل تھا۔ اس لیے اس پہلو پر بھی غور ہونا چاہئے کہ کیا صرف پتھر پھینکنا ہی اس بڑے فساد کا سبب ہوا یا پچھلے دس دنوں سے جو سوچی سمجھی سیاسی تحریک چل رہی تھی وہی اس فساد کا خاص سبب تھی جس کی وجہ سے کشیدگی پیدا ہوئی تھی۔

بھیونڈی فسادات - 1970ء

بھیونڈی کا اب تک کا سب سے بڑا فساد 7/ مئی 1970ء کو شیو (شیوا جی) جینتی کے جلوس پر مسلمانوں کے پتھراؤ سے شروع ہوا۔ ایک جملہ پر مشتمل یہ بیان فساد کی شروعات کی بڑی آسان وجہ پیش کرتا ہے۔ لیکن واقعات کے تسلسل کو ذرا گہرائی سے دیکھیں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اتنی آسانی سے نتیجہ نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔ بھیونڈی میں اصل فسادات سے کافی پہلے سے ہی فرقہ وارانہ کشیدگی کی حالت بنی ہوئی تھی۔ یہ تناؤ صرف اسی سال نہیں بلکہ پچھلے کئی برسوں سے شیو جینتی کے موقع پر پیدا ہوتا چلا آرہا تھا۔ دراصل عوامی سطح پر بڑے پیانے پر شیو جینتی منائے جانے کی روایت 1964ء سے شروع ہوئی تھی۔ پہلے ہی سال سے شیو جینتی نے بھیونڈی میں فرقہ پرستی کا زہر گھولنا شروع کر دیا۔ کھلے عام مسلم مخالف نعرے لگا کر اور بھڑکانے والی جھانکیاں نکال کر' جلوس کے منتظمین نے کبھی اپنی نیت چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ مسلم اکثریتی بستیوں سے جلوس نکالنے پر زور' مسجدوں پر گلال پھینکنے کی ضد یا پولیس کے منع کرنے پر بھی "جو ہم سے ٹکرائے گا وہ مٹی میں مل جائے گا" جیسے نعرے لگا کر منتظمین نے پہلے سال سے ہی فساد کرانے کی پوری کوشش شروع کر دی۔ اپنے اعلیٰ افسران کو بھیجی گئی رپورٹ میں تھانے کے ایس پی نے واضح طور پر کہا ہے: "......میں نے جانچ کی کہ ہندوؤں کا ایک طبقہ' خاص طور سے آر ایس ایس اور پی ایس پی کے کچھ لوگ تشدد پھیلانے پر آمادہ تھے۔ جلوس کے ساتھ چلنے کے پیچھے

ان کے دل میں مہان شواجی کے تئیں خراج پیش کرنے کا کم اپنا حق منوانے کا جذبہ زیادہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اگر ممکن ہو تو وہ مسلمانوں کو اکسانا اور بے عزت کرنا بھی چاہتے تھے"[1]

1964ء کے پہلے بڑے عوامی مظاہرے کے بعد 1965 اور 1966 میں نکالے گئے شیو جینتی جلوسوں کے دوران فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہوتے بچا۔ لیکن 11/ مئی 1967ء کو نکالے گئے شیو جینتی جلوس کے دوران بھیونڈی کی تاریخ میں پہلا فرقہ وارانہ فساد ہو ہی گیا۔ پولیس کے ریکارڈ اور جسٹس ڈی پی مدان جانچ کمیشن کی رپورٹ میں دی گئی تفصیلات سے یہ ظاہر ہے کہ یہ فساد جلوس میں شریک لوگوں کے غیر ذمہ دارانہ برتاؤ کا نتیجہ تھا۔ پولیس کو آخر تک جلوس کے راستے اور وقت کے بارے میں اندھیرے میں رکھنے، روکنے پر اشتعال انگیز نعرے لگانے اور مسجدوں پر گلال پھینکنے سے یہ ظاہر تھا کہ کچھ لوگ فساد کرانا چاہتے تھے اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس کوشش کے پیچھے کون سی طاقتیں تھیں اور کسے کامیابی کا انعام ملا، یہ سمجھنے کے لیے جسٹس مدان کا یہ تبصرہ کافی ہوگا: "......1967ء کے میونسپل انتخاب میں، جہاں تک ہندو کارپوریٹروں کا سوال تھا، وہ سبھی لوگ جیتے، جنھوں نے شیو جینتی میلے میں سرگرم حصہ لیا"۔[2]

1967ء کے فسادات نے بھیونڈی شہر کی پوری زندگی کو جس میں میونسپل بورڈ کی سیاست بھی شریک تھی، فرقہ پرستی کے زہر سے آلودہ کر دیا۔ 1968 اور 1969ء کے سال کشیدگی کے چھوٹے بڑے واقعات سے خالی رہے۔ ان دونوں برسوں میں شیو جینتی جلوسوں سے پہلے اور ان کے نکلنے کے دوران تنازعہ پیدا ہوا، لیکن فساد نہیں ہوا۔ اس ماحول میں یہ غیر فطری نہیں تھا کہ 1969 اور 1970ء کے دوران چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھیونڈی میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ طلباء کے پروگراموں، میونسپلٹیوں کی سرگرمیوں اور مذہبی تہواروں کے الگ الگ مواقع پر بڑا فساد ہوتے ہوتے بچا۔ اس دوران ہندو اور مسلم دونوں کی فرقہ پرست تنظیموں نے بھیونڈی اور اس کے قرب و جوار میں اپنی جڑیں پھیلائیں اور اپنے لیڈران کے ذریعہ شہر میں زہر افشانی کرائی۔

کشیدگی، نفرت اور بے اعتمادی کے ایسے ماحول میں 7/ مئی 1970ء کو شیو جینتی کا جلوس نکلا۔ ہندو فرقہ پرست تنظیمیں کئی دنوں سے آس پاس کے قصبوں اور گاؤں میں زہر

---

1. "بھیونڈی فساد کی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ" باب اوّل صفحہ 165-
2. آئی جی آئی ڈی صفحہ 17-

افشانی کر رہی تھیں۔ ان کے پروپیگنڈے کے باعث ہزاروں کی تعداد میں آس پاس کے مسلح ہندو صبح ہی سے بھیونڈی پہنچنے لگے تھے۔ جلوس میں شریک لوگ نہ صرف مٹی کا تیل، لاٹھی، بھالے اور تیشے جیسے ہتھیاروں سے لیس تھے بلکہ کھلے عام ان کی نمائش بھی کر رہے تھے۔ پچھلے سالوں کی طرح مسلمانوں کے خلاف ہتک آمیز اور اشتعال انگیز نعرے لگ رہے تھے۔ مسلمانوں کی آبادی یا مسجدوں کے سامنے پہنچ کر جلوس' زیادہ اکسانے والا برتاؤ کرنے لگتا تھا۔ منع کرنے کے باوجود بھی گلال اس طرح اڑایا جا رہا تھا کہ وہ مسجدوں پر جاکر گرے۔

اتنے اشتعال اور خوف وہراس کے دوران یہ فطری ہی تھا کہ مسلمانوں نے بھی اپنی حفاظت کا بندوبست کیا ہوگا۔ گرچہ فساد کی شروعات کو لے کر ہندوؤں اور مسلمانوں نے الگ الگ قصے جانچ کمیشن کے سامنے رکھے اور یہ تنازعہ طے نہیں ہو پایا کہ کس نے پہلا حملہ کیا۔ پھر بھی اگر ہم یہ مان لیں کہ پہلا پتھر کسی مسلمان نے پھینکا تو کیا اس سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ 7/ مئی 1970ء کو بھیونڈی میں ہونے والا فساد مسلمانوں کی فطری سفاکی اور تشدد پسند رویے کا نتیجہ تھا؟ کسی مسلمان کے ذریعہ پھینکا گیا پہلا پتھر ایک ڈرے ہوئے فرقے کا ردِ عمل زیادہ لگتا ہے کیونکہ ایک ڈرا ہوا فرقہ اکثر پہلے ہی ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔

پہلا پتھر پھینکنے یا پہلا ہاتھ اٹھانے کا عمل کچھ اس طرح واقع ہوتا ہے کہ کسی انجانے ہاتھ کی دلچسپی اس بات میں ہے کہ اقلیت پہل کرے تاکہ اس کی پٹائی کا جواز پیدا ہو سکے۔ یہ انجانا ہاتھ کسی فرقہ پرست تنظیم کا ہو سکتا ہے اور بہت سے مواقع پر کسی سیاسی پارٹی کا بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ فرقہ پرست تنظیم یا سیاسی پارٹی ہندو مفادات کی نمائندہ ہو۔ بعض اوقات اقلیتی فرقے کی تنظیموں کے مفادات بھی اس میں ہو سکتے ہیں کہ فساد ہوں اور ان میں مسلمان پٹیں تاکہ انھیں ایک فرقے کے طور پر کسی پروگرام میں سرگرم کیا جا سکے۔ اگر ایک موٹی مثال کی طرح لیں تو مسلمانوں کو پہل پر مجبور ہونے یا ان کے ذریعہ پہل کرنے کے پیچھے ایک اور ذہنیت کام کرتی ہے۔ بین الاقوامی برادری کی رائے' ہندوستانی پریس کے بڑے حصے کے نرم اور سیکولر ہونے' آزاد عدلیہ' اجتماعی حق رائے دہندگی کی وجہ سے اقلیتوں کو مخاطب کرنے کی سیاسی جماعتوں کی مجبوری' جدید اور سائنسی تعلیم اور بڑے پیمانے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک دوسرے کے رابطے میں آنے کے سماجی اور معاشی مواقع' کچھ ایسے اسباب ہیں جن کے باعث کوئی طاقتور فرقہ (ہم عصر ہندوستانی تناظر میں ہندو) کسی کمزور فرقہ (مذکورہ معنوں میں

مسلمان) پر پہلے جسمانی حملہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ایسی کسی پہل سے اُسے کسی بیرونی رائے کا سامنا کرنا پڑے گا جو ابھی تک مانتی رہی ہے کہ یہ فرقہ فطرتاً صلح پسند اور معتدل ہے۔ بیرونی مخالفت سے بچنے اور بہتر شبیہ کو بنائے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلا حملہ مسلمان کریں اور اس طرح وہ اپنے ہونے والے نقصان کے لیے جواز تیار کریں۔ یہ بہت کچھ ایسا ہے جیسے کوئی طاقتور آدمی کسی کمزور کو ڈھکیلتے ہوئے کسی دیوار تک لے جائے اور پھر اس کے منہ پر تھوک کر اُسے پہلے ہاتھ اٹھانے کے لیے مجبور کردے تاکہ بعد میں اس کی پٹائی کی جاسکے۔ اس پٹائی سے پہلے یا بعد میں یہ شور بھی بخوبی مچایا جاسکتا ہے کہ مخالف نے فطرتاً تشدد پسند اور ظالم ہونے کے سبب پہلے حملہ کیا۔

جمشید پور (1979ء) اور بنارس (1977ء) کے فسادات' ان بہت سی مثالوں میں سے ہیں جن کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ کس طرح سے فرقہ وارانہ ماحول میں مسلمانوں کو پہل کرنے کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ دونوں مقامات پر فساد مذہبی جلوسوں کے راستوں کے تنازعہ پر ہوئے۔ دونوں مقامات پر ہندو فرقہ پرستوں نے جلوس کو ایسے راستوں سے لے جانے کی ضد کی جن پر مسلم آبادی یا مسجدیں تھیں۔ یہ راستے پہلے اس طرح کے جلوس کے لیے استعمال نہیں کیے گئے تھے۔ دونوں ہی جلوس متنازعہ راستوں سے لے جاکر کسی مسلم علاقے میں روک دیے گئے اور مشتعل مسلح بھیڑ کے ذریعہ بھڑکانے والی کارروائیاں اس وقت تک جاری رہیں جب تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا پتھر نہیں آگیا۔ پہلا پتھر آتے ہی اکثریتی فرقے کا تشدد جائز ہو گیا اور مسلمانوں کے جان و مال کا بڑے پیمانے پر نقصان ہوا۔ ان دونوں فسادات کے تفصیلی مطالعہ کے بغیر ہم اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکیں گے۔

جمشید پور فسادات - 1979ء

اپریل 1979ء میں جمشید پور میں بھڑکنے والا تشدد اس وقت کی حکمراں جماعت جنتا پارٹی کے اندرونی خلفشار کا نتیجہ تھا۔ بہار میں کرپوری ٹھاکر کی حکومت جنتا پارٹی کی تھی اور اس میں سابق جن سنگھ گروپ کے لوگ بھی شامل تھے۔ جمشید پور کا مقامی ایم ایل اے جن سنگھ گروپ کا تھا اور وہ ایک فرقہ پرست شخص کے طور پر مشہور تھا۔ جمشید پور میں برسوں سے رام

نومی کا جلوس نکالنے کا رواج تھا اور اس کے لیے راستے بھی طے شدہ تھے۔ 1978ء میں پہلی بار حکمراں جماعت میں ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مقامی ایم ایل اے اور ہندو تنظیموں نے انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر متعین راستے سے الگ گلی نمبر 14 سے جلوس اور ساتھ میں چلنے والے اکھاڑوں کو نکالنے کی اجازت حاصل کرلی۔ یہ راستہ مسلم آبادی اور مسجد کے سامنے سے ہو کر جاتا تھا۔ یہ فطری تھا کہ جلوس نکلنے پر کشیدگی بڑھتی۔ یہ کشیدگی اس لیے اور زیادہ بڑھی کیونکہ جلوس مسلح تھا اور اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔ کسی طرح انتظامیہ نے بخیر وخوبی جلوس نکلوادیا۔ 1979ء میں بھی منتظمین نے گلی نمبر 14 سے جلوس نکالنا چاہا' لیکن اس بار انتظامیہ نے متعین راستوں کے علاوہ کسی دوسرے راستے سے جلوس نکالنے کی اجازت دینے سے منع کر دیا۔ جلوس کے راستے کو موضوع بنا کر ہندو تنظیموں نے شہر میں مسلسل زہر افشانی کی اور شہر کے ماحول میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی۔ 7/اپریل کو رام نومی مرکزی اکھاڑہ کمیٹی نے ایک پرچہ تقسیم کیا جس میں فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے والی باتیں تحریر تھیں۔ اس تنازعہ کے پس منظر میں ایک بات اور تھی۔ جمشید پور اس وقت پوری طرح سے ہندو اور مسلم جرائم پیشہ مافیاؤں کے چنگل میں تھا۔ ایک ایماندار اور سخت ایس پی کی بحالی وہاں ہو گئی تھی' جو دونوں کی آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔ یہ عناصر بھی فساد کرانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

11/اپریل 1979ء کو جلوس نکالنے والے عناصر نے اپنے ارادے شروع سے ہی ظاہر کر دیے۔ دوپہر دو بجے کے بعد جلوس نکالنے کا اعلان کر کے 12/بجے ہی جلوس نکال دیا گیا۔ جلوس میں باہر سے ہزاروں کی تعداد میں مسلح افراد کو بلایا گیا تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے نکلے۔ پولیس کے سنبھلنے کے پہلے ہی جلوس نے اپنا راستہ بدل دیا اور گلی نمبر 14 پر زبردستی بڑھ گیا۔ جلوس کے ساتھ اکھاڑے بھی تھے' جن میں شریک ہونے والے کھلے عام تلواریں' بھالے چمکاتے ہوئے چل رہے تھے۔ اس کے بعد وہ واقعہ ہوا جس سے فساد کی شروعات کے مفروضہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ جلوس جب مسلم بستی میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں شہر کی بڑی اور اہم (جامع) مسجد تھی' تو اسے روک دیا گیا۔ وہاں سے آگے بڑھنے کی شرط کی شکل میں افسران کے سامنے ایسے مطالبات رکھے گئے جن کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ایم ایل اے اور دوسرے لوگوں نے آگ اگلنے والی تقریریں شروع کر دیں۔ کشیدگی کے اس ماحول میں جلوس نے جم کر اپنے ہتھیاروں کی نمائش کی اور اشتعال انگیز نعرے لگائے۔ لیڈروں کے

ذریعہ بھیڑ کو مشتعل کرنے اور افسران کے ذریعہ جلوس کو کسی طرح آگے بڑھانے کی کوششیں کئی گھنٹوں تک جاری رہیں۔

جہاں جلوس رکا تھا‘اس کے چاروں طرف مسلم آبادی تھی۔ مسلح، مشتعل اور فساد پر آمادہ بھیڑ سے خود کو محصور پاکر مسلمانوں نے بھی اپنے گھروں کی چھتوں پر اینٹ‘ پتھروں سے لے کر کھولتے تیل اور لاٹھی بھالے اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ مسجد میں بھی کافی مسلمان موجود تھے۔

اس وقت بھیڑ کے برتاؤ کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ایسا گروہ تھا جو کسی نہ کسی طرح اپنے مخالف کو مشتعل کر کے اس سے پہلے پتھر کی آرزو کر رہا تھا۔ کچھ گھنٹوں کی کوشش سے اسے یہ پہلا پتھر مل بھی گیا۔ شام ہونے سے کچھ پہلے مسجد سے پہلا پتھر آیا اور پورے شہر میں قتل عام شروع ہو گیا۔ اکثریتی فرقے کو اپنے تشدد کو جائز ٹھہرانے کا موقع مل گیا۔

بنارس کا فساد - 1977ء

1977ء میں بنارس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ہر سال درگا پوجا کے موقع پر بنگالی محلوں سے درگا کے مجسمے غرقاب کرنے کے لیے گنگا کے کنارے تک لے جائے جاتے ہیں۔ بنگالیوں کے محلے شہر کی گھنی آبادی میں مسلم محلوں کے پاس ہیں۔ درگا کے مجسموں کو غرقاب کرنے کے لیے راستے طے ہیں۔ درگا پوجا کے کچھ پہلے اینگلو بنگالی کالج اور اس کے پاس آباد جولاہوں کی بستی میں کالج کی دیوار ٹوٹنے‘ جولاہوں کے ذریعہ کالج کے میدان میں سوت پھیلانے اور کالج کے لڑکوں کے کھیلنے کے سوال پر‘ فرقہ وارانہ تنازعہ پیدا ہو چکا تھا اور اس کے باعث قرب وجوار میں کشیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ گولڈن اسپورٹنگ کلب نامی بنگالی نوجوانوں کے ایک کلب نے مورتیوں کو غرقاب کرنے کے لیے طے شدہ راستے سے ہٹ کر ایک دوسرے راستے کا مطالبہ کیا‘ جو مسلم اکثریتی علاقے کی تنگ گلیوں سے ہو کر گزرتا تھا۔ واضح تھا کہ یہ مانگ شرانگیزی کا حصہ تھی اور خاص مقصد سے کی جا رہی تھی۔ انتظامیہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ 22/اکتوبر 1977ء کو انتظامیہ نے مورتیوں کو طے شدہ راستوں سے لے جا کر غرقاب کروا دیا۔

پُر امن طریقے سے مورتیوں کے غرقاب ہونے سے ان طاقتوں کا مقصد پورا نہیں ہوا جو طے شدہ راستوں سے ہٹ کر نئے راستے کی مانگ کر رہی تھیں۔ انھوں نے اسی رات ایک دوسری مورتی، پرانی مورتی کی جگہ دوبارہ رکھ دی۔ 23 / اکتوبر کو صبح انھوں نے نئی مورتی کو اسی راستے سے نکالنے کی درخواست کی، جس پر انھیں پہلے اجازت نہیں ملی تھی۔ انتظامیہ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی ضد پوری طرح غلط ہے، انھیں سمجھانے بجھانے کا راستہ اپنایا اور ان کے ساتھ ضروری سختی نہیں کی۔ جہاں یہ تنازعہ چل رہا تھا، وہ جگہ بنارس کی سب سے گھنی اور ملی جلی آبادی والا علاقہ تھا۔ گھنٹوں جاری رہے اس تنازعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے چلے گئے اور پورے شہر میں افواہوں کا بازار گرم ہو گیا۔ واقعات کے اس سلسلے کا نتیجہ بھی وہی نکلا، جو اس طرح کے موقع پر نکل سکتا تھا۔ ہندو لیڈر شپ پورے شہر کے ہندوؤں سے یہ بات چھپا کر کہ اصل مورتی تو پہلے ہی غرقاب ہو چکی ہے، انھیں یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئی کہ مسلمانوں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کی درگا مورتی غرقاب نہیں ہو پا رہی ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں خوف تھا کہ اگر ہندو ان کے علاقے سے جلوس کی شکل میں درگا مورتی لے کر جائیں گے تو وہ ان پر حملہ کر سکتے ہیں۔ کئی گھنٹوں تک سڑک پر ہوئے بحث و مباحثے اور اشتعال کے نتیجہ میں کشیدگی ایک ایسے نقطے پر پہنچ گئی، جہاں صرف ایک پتھر، بڑے پیمانے پر فساد برپا کرانے کے لیے کافی تھا۔ یہ پتھر کسی مسلم گھر کی چھت سے آ بھی گیا اور فساد شروع ہو گیا۔

مذکورہ بالا مثالیں یہ سمجھنے میں مدد دیں گی کہ فساد کی شروعات صرف وہ نقطہ نہیں ہوتا، جہاں سے تشدد شروع ہوتا ہے۔ اس نقطے کے کافی پہلے سے کشیدگی کی شروعات ہو جاتی ہے اور یہ کشیدگی مخروطی شکل میں آہستہ آہستہ اوپر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مخروطی مینار کا عروج ایک ایسے نقطے سے بنتا ہے، جسے ہم نقطۂ عروج بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نقطے پر کوئی بھی کارروائی، جس میں دو مختلف مذہبی فرقے شامل ہوں اور جس کی بنیاد میں تشدد پوشیدہ ہو، بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد کرا سکتی ہے۔ اگر کشیدگی کی یہ مخروطی شکل موجود نہ ہو تو کئی بار بہت سنگین فرقہ وارانہ واردات کے باوجود فساد نہیں ہوتا۔ اس لیے فسادات کی شروعات کی ذمہ داری کا تعین کرتے وقت اس کے پس منظر کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مخروطیت کی تعمیر میں کس فریق کا کتنا حصہ ہے۔

فسادات کی شروعات کے نظریے کو پرکھتے وقت ہمیں ایک بات اور ذہن میں رکھنی چاہئے۔ جو فرقہ فساد شروع کرے گا' اس کے پہلے وہ کچھ تیاری بھی کرے گا۔ اس تیاری میں ہتھیاروں کا اکٹھا کرنا سب سے اہم ہوگا۔ امن پسند ہونے کی وجہ سے ہندو مذہبی جلوس کے پاس ہتھیار نہیں ہوں گے یا ہوں گے بھی تو تیاری کر چکے فرقے سے ہلکے۔ اس لیے ہندو شروع میں مقابلے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ جو پہلے حملہ کرے گا' وہ کچھ وقت تو فائدے کی پوزیشن میں رہے گا۔ اخباروں (بالخصوص علاقائی) اور پولیس دستاویزوں میں درج مختلف فسادات کی خبریں پڑھتے وقت زیادہ تر فسادات کا سبب کسی مذہبی ہندو جلوس پر مسلمانوں کا حملہ لگتا ہے۔ اس سبب کو اگر ہم قبول کرلیں تو پھر یہ سوچنا بھی صحیح ہوگا کہ ان حملوں میں 'شروع میں ہندوؤں کو زیادہ نقصان اُٹھانا چاہئے۔ بعد میں مسلمانوں کے زیادہ نقصان کے بارے میں ہندو ذہن کے پاس اپنے اسباب ہیں۔ اس کے مطابق مسلمان شروعات تو کر دیتے ہیں لیکن بعد میں پولیس 'مسلح فورسز (پی اے سی 'بی ایم پی 'ایس آر پی وغیرہ) اور فوج کے آنے کے بعد پوزیشن بدل جاتی ہے۔ مسلمانوں کا نقصان خاص طور سے ان فورسز کے ذریعہ ہندوؤں کو بچانے کی کارروائی کے نتیجے میں ہوتا ہے۔

لیکن دو حقائق اس سوچ کو غلط ثابت کر دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد ہوئے زیادہ تر بڑے فسادات میں شروعات سے ہی مسلمانوں کا نقصان زیادہ ہوا ہے۔ ایک متشدد' پہلے سے ہی تیار اور شروعات کرنے پر آمادہ فرقے کو تشدد کے شروعاتی دور میں جو فائدے ملنے چاہئیں' وہ ان فسادات میں کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ بھی توجہ کی بات ہے کہ پولیس ہمارے ملک میں تربیت' وسائل اور تعداد کے لحاظ سے کبھی اتنی بہتر پوزیشن میں نہیں ہوتی کہ کسی بڑے فساد میں فوری اور موثر مداخلت کر سکے۔ پی اے سی' بی ایم پی اور ایس آر پی جیسی مسلح پولیس فورس اور فوج' بی ایس ایف یا سی آر پی جیسی مرکزی فورسز' بہت بعد میں اور کئی بار دو تین دن بعد ہی فساد پر کنٹرول کرنے کے لیے پہنچ پاتی ہیں۔ لہٰذا ابتدائی مرحلہ میں خاص طور سے ہندو اور مسلم فسادیوں کے لیے یہ اپنی طاقت کے مظاہرے کا کھلا موقع ہوتا ہے۔ جس میں مقامی پولیس بھونچکی اور بے بس تماش بین کی حالت سے اوپر اُٹھ کر موثر مداخلت کی تیاری کرتی دکھائی دیتی ہے۔ پولیس یا حفاظتی دستوں کی زور آزمائی کے سلسلے میں یہ بھی دھیان رکھنا چاہئے کہ ان کے پاس ممنوعہ بور کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ فساد میں مرنے والے لوگوں کی موت' زیادہ تر چاقو' چھرے یا بارہ بور کی

بندوق کی فائرنگ یا آگ زنی اور اینٹ پتھروں کے حملوں سے ہوتی ہے۔اس لیے یہ دلیل کہ مسلمانوں کا خاص نقصان' حفاظتی دستوں کے ذریعہ زور آزمائی سے ہوتا ہے' مناسب نہیں ہے۔ حفاظتی دستوں کی گولیوں سے مرنے والوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہوتی ہے۔ان کی مداخلت تو ایک دوسرے معنوں میں ہندو فسادیوں کی مدد کرتی ہے اور وہ ہے فسادات کے دوران ہندو فسادیوں کے ساتھ ان کا نرم رویہ۔اس موضوع پر کتاب کے چوتھے باب میں تفصیل سے غور کیا گیا ہے۔

(د)

بے قابو بھیڑ فرقہ وارانہ فسادات میں سب سے اہم عنصر ہے۔ کشیدگی کے جس مخروطی مینار کا ذکر اوپر ہوا ہے اس کا نقطہ' آغاز' یعنی وہ نقطہ جہاں سے تشدد شروع ہوتا ہے عام طور سے تب تک نہیں بن سکتا جب تک ایک پاگل بھیڑ اس نقطے پر موجود نہ ہو۔ بھیڑ کے کردار کی کچھ بنیادی خوبیاں ہوتی ہیں' ان خوبیوں کو سمجھے بغیر بھیڑ کے برتاؤ اور فساد میں اس کے کردار کو سمجھنے میں مشکل ہوگی۔ بھیڑ (Crowd) اور بے قابو بھیڑ (Mob) کے درمیان کا فرق ان کے اندر موجود غصے کی مقدار سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں بھیڑ کے درمیان غصہ کئی موقعوں پر پوری طرح غائب ہو سکتا ہے وہیں بے قابو بھیڑ بغیر غصے کے دھماکہ خیز نقطے پر نہیں پہنچ سکتی۔اس مطالعے میں جہاں جہاں "بھیڑ" لفظ کا ذکر ہوا ہے' اس کا مطلب "بے قابو بھیڑ" (Mob) سے ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے تعلق سے بھیڑ بہت سارے لوگوں کی بے ترتیب جماعت کو کہہ سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں شامل سبھی لوگوں کے سامنے' وہاں موجود ہونے کے یکساں اسباب ہوں۔ مثال کے لیے ظاہری طور سے مذہبی جنون میں مبتلا دکھائی دینے والی بھیڑ میں بہت سے لوگ دوسرے اسباب سے بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ بھیڑ کے ایک حصے کے سامنے اپنے مذہب کی توہین کا بدلہ لینے یا مخالف مذہبی لوگوں کو سبق سکھانے جیسا کوئی سبب ہو سکتا ہے' بھیڑ میں شامل ایک دوسرے گروہ کی توجہ کا مرکز بھیڑ کے ذریعہ برپا کیے گئے تشدد کے آئندہ چناؤ پر پڑنے والے اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔ان اسباب کے علاوہ بہت سے دیگر اسباب سے بھیڑ بنانے والے عناصر وہاں موجود ہو سکتے ہیں۔ بھیڑ کی تشکیل

میں سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بھیڑ کا ایک بہت بڑا حصہ وہاں بے وجہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ حالت بازاروں، سرکاری دفتروں، کچہریوں یا تعلیمی اداروں کے آس پاس دکھائی دیتی ہے۔ ان مقامات پر دن کے مخصوص اوقات میں ہمیشہ ہی کافی تعداد میں لوگ جمع رہتے ہیں اور کوئی بھی موثر سرگرمی انھیں اپنی طرف کھینچ سکتی ہے۔ ہندوستانی پس منظر میں اس کی دو اہم مثالیں ہیں۔ رام جنم بھومی تحریک میں ہندتووادی طاقتوں نے ایودھیا میں اپنے بڑے پروگراموں کے دوران ہمیشہ ان دنوں کو منتخب کیا، جب وہاں کسی اہم ہندو تہوار کے سبب کافی تعداد میں لوگوں کا اجتماع ہو۔ ظاہر تھا کہ اس کے پیچھے مقصد صرف یہ تھا کہ انھیں لوگوں کو جمع کرنے میں اپنی توانائی خرچ نہ کرنی پڑے۔ دوسری مثال مسلم رہائشی علاقوں کی ہے جہاں چوبیسوں گھنٹے لوگ سڑکوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان علاقوں میں بھی بلغیر کسی کوشش کے بھیڑ جمع کی جا سکتی ہے۔ اکثریتی فرقہ، مسلمانوں کے ذریعہ فساد شروع کرنے کے نظریے کی حمایت میں یہ دلیل بھی دیتا ہے کہ فساد وہیں ہوتے ہیں جہاں مسلمانوں کی گھنی آبادی ہوتی ہے۔ یہ سوچ کسی سہل پسندی کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس میں ضرور سچائی ہے۔ گھنی مسلم آبادی میں رات دن سڑکوں پر بھیڑ جمع ہونے کے کچھ معاشی اور سماجی اسباب ہیں، جن کے بارے میں ہم آگے غور کریں گے۔

قیادت کا کردار اکثر بھیڑ جمع کر کے اسے اشتعال کے نقطۂ عروج پر پہنچانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ بہت کم مواقع پر ہم پائیں گے کہ تشدد کے دوران بھیڑ میں قیادت کا سلسلہ برقرار رہ پایا ہو۔ قیادت کے حاشیے پر جانے کا عمل اس کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک بار بڑی تعداد میں لوگوں کو جمع کرنے کے بعد قائدین میں مقبولیت کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ مجتمع بھیڑ تالیوں اور نعروں سے اپنے جذبات کے اظہار کے ذریعہ قیادت کے تئیں اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔ یہ رضامندی حاصل کرنے کے لیے قیادت کی تقریری صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے۔ تقریر جتنی اشتعال انگیز ہوتی ہے، بھیڑ سے اُسے اتنی ہی داد ملتی ہے۔ تقریری صلاحیت اور عوامی مقبولیت کے درمیان اکثر خاص قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں قیادت کے اندرونی اختلافات بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ رہنمائی کر رہے لوگ مختلف طبقے کے سامعین سے بہتر ردِّ عمل حاصل کرنے کے لیے زیادہ اشتعال انگیز تقریر کرنے کی ہوڑ میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک شیطانی چکر کی شروعات ہوتی ہے اور یہ شیطانی چکر اشتعال انگیز تقریر، جوشیلے ردِّ عمل اور تقریر کی مزید اشتعال انگیزی کے نتیجے میں مجمع کو ہسٹیریا اور جنون

کی حد تک لے جاتا ہے۔ اس سطح پر پہنچنے کے عمل میں آہستہ آہستہ قیادت کا کردار کم ہوتا جاتا ہے۔ جنونی بھیڑ یا تو پوری طرح رہنمائی سے محروم ہو جاتی ہے یا پھر اس میں شامل ایرے غیرے اس کی قیادت سنبھال لیتے ہیں۔ بہت سے مواقع پر ہم پائیں گے کہ بھیڑ کے ذریعہ تشدد کی شروعات یا پولیس سے اس کا سامنا ہوتے ہی بڑے سیاسی لیڈر وہاں سے رفو چکر ہو جاتے ہیں۔

جنونی بھیڑ عام طور سے بہت مشتعل ہوتی ہے اور اپنے اشتعال کو ظاہر کرنے کے لیے شور، مٹھیاں لہرانے اور بے قابو ڈھنگ سے اچھل کود کرنے جیسے طریقوں کا سہارا لیتی ہے۔ بھیڑ کو خطاب کرنے والے مقررین کی آواز، اکثر بھیڑ کی آواز میں گم ہو جاتی ہے اور اس میں موجود ہر شخص کھوئی ہوئی آوازوں کی اپنے اپنے طریقے سے گونج بناتا ہے۔ واقعات کو سمجھنے کے لیے دلیل کی جگہ مشورے زیادہ موثر ہو جاتے ہیں۔ افواہیں عام طور سے مستند خبروں کا بدل بن جاتی ہیں۔ بھیڑ کے زیادہ سرگرم ممبران، کم سرگرم ممبران کو اپنے مشوروں اور زبانی، جسمانی اشاروں سے اپنی تقلید کرنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔

بھیڑ کی شکل وصورت کا ایک دیگر لازمی عنصر ظلم و بربریت ہوتا ہے۔ بھیڑ کے ممبران اپنی ذاتی زندگی میں اس حد تک ظالمانہ برتاؤ کا تصور نہیں کر سکتے جس حد تک بھیڑ میں شامل ہو کر وہ کر بیٹھتے ہیں۔ روایتی طور سے امن پسند یا نسبتاً کم امن پسند فرقے بھی بھیڑ میں تبدیل ہونے کے بعد حیرت انگیز طور پر ظالمانہ سلوک کرتے دیکھے گئے ہیں۔ ہندوستانی پس منظر میں خواتین، بودھوں یا جینوں کے ذریعہ اجتماعی تشدد میں شریک ہونے کی مثالیں اسی درجے میں آئیں گی۔ جیسے جیسے ہمارے معاشرے میں تشدد بڑھتا جارہا ہے ویسے ویسے اجتماعی سرگرمیوں کے دوران بھیڑ کا تشدد بھی بڑھتا جارہا ہے۔ ہمعصر ہندوستانی سماج میں بھیڑ کے غیر انسانی ہونے کی سب سے وحشیانہ مثال مسز اندرا گاندھی کے قتل 31/اکتوبر 1984ء کے بعد دیکھنے کو ملی۔ اگلے چار پانچ دنوں میں چار ہزار سے زائد سکھوں کا قتل کر دیا گیا۔ یہ قتل ہر جگہ جنونی بھیڑ نے کیا۔ بھیڑ نے سکھوں کو بے رحمی سے مارا۔ عام چوراہوں وغیرہ پر انھیں زندہ جلایا گیا۔ اور جلتے ہوئے لوگوں کے چاروں طرف بھیڑ تالیاں بجا بجا کر رقص کرتی رہی۔ بھیڑ میں شامل زیادہ تر لوگ اکیلے ہوتے تو ایسے کسی گھناؤنے کام میں شامل ہونا تو دور اُسے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

مشہور سماجوادی مفکر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے بھیڑ کا حصہ بن چکے متوسط ہندوستانی

کے برتاؤ کو سمجھنے کے لیے 'ظالمانہ بزدلی' کا لفظ کا استعمال کیا ہے۔ ایک متوسط ہندوستانی بزدل بھیڑ میں شریک ہوتے ہی حد درجہ تک ظالم ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں روز اپنی سماجی زندگی میں ملتی ہیں۔ بس اسٹاپ پر ایک جیب کترے کو پکڑ کر بھیڑ کے ذریعہ پیٹ پیٹ کر جان سے مار ڈالنا یا دیہی علاقوں میں کسی عورت کو ڈائن قرار دے کر گاؤں والوں کو اسے زندہ جلا دینا' ایسی ہی چند مثالیں ہیں۔ ایک اکیلا غنڈہ پورے محلے کے سامنے کسی کمزور کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور محلے کے لوگ کھڑکی دروازے بند کر کے گھروں میں چھپے رہتے ہیں' لیکن اگر ایک لاغر چور پکڑ لیا جاتا ہے تو یہی لوگ اس کی پٹائی کرنے کے لیے شیر بن جاتے ہیں۔ ہر آدمی اس کی پٹائی میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ متوسط ہندوستانی کے کردار میں پوشیدہ یہی 'ظالمانہ بزدلی' بھیڑ میں شامل ہوتے ہی وحشیانہ ظلم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

گھنی آبادی والے رہائشی مسلم علاقوں میں چوبیسوں گھنٹے سڑکوں اور عام مقامات پر لوگوں کی بھیڑ دیکھی جا سکتی ہے۔ بے مقصد مٹرگشتی کرتے ہوئے لوگ تشدد کے لیے آسانی سے اکسائی جا سکنے والی بھیڑ کا آسان حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے گھنی آبادی والی مسلم بستی میں ایسی ہی کسی ہندو بستی کے مقابلے زیادہ تیزی سے تشدد پھیلایا جا سکتا ہے۔ ہندتووادی طاقتیں مسلم علاقوں میں لوگوں کے رات دن سڑک پر موجود رہنے کے اسباب لاقانونیت اور تشدد کی طرف اس فرقے کا گہرے رجحان میں تلاش کرتی ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے ان کے سماجی اور معاشی اسباب ہیں' جنہیں سمجھے بغیر مسلم بھیڑ کے برتاؤ کو سمجھنا مشکل ہوگا۔

ہندوستانی سماج میں رہائشی بستیاں تاریخی اسباب سے مذہب اور ذاتوں کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں۔ خورد و نوش' رسم و رواج اور سماجی تحفظ جیسے اسباب سے دیہی اور شہری دونوں علاقوں میں مختلف فرقوں کے رہائشی علاقوں کے درمیان بٹوارے کی لکیر کافی صاف دکھائی دیتی ہے۔ جہاں مسلمان نہیں تھے' ان گاؤوں یا شہروں میں ہندو آبادی ذاتوں کی بنیاد پر علاقے بانٹ کر رہتی تھی۔ ایک بڑی مسلم آبادی میں تجارتی پیشوں اور سماجی' معاشی حیثیت کے مطابق لوگ الگ الگ ٹولے بنا کر رہتے تھے۔ آزادی کے بعد بھی کم و بیش یہی حالت بنی رہی۔

تقسیم کے وقت متوسط مسلم طبقہ کا زیادہ تر حصہ بہتر مستقبل کی اُمید میں پاکستان چلا گیا۔ ان میں وکیل' ڈاکٹر' معلم' تاجر' صنعت کار جیسے پیشہ ور لوگ شامل تھے۔ ان پیشہ ور لوگوں کی ہجرت نے رہائشی علاقوں کی بناوٹ پر خاص طرح کا اثر ڈالا۔ ایک بڑا متوسط طبقہ' کسی

فرقے کی زندگی کو کئی سطحوں پر متاثر کرتا ہے۔ ان میں فنِ تعمیر' رہائشی علاقوں میں نالیوں' سیوریج اور پارک جیسی سہولیات کے متعلق فرقے کی ترجیحات اور سوچ بھی شامل ہے۔ متوسط طبقے کے لوگوں کی کمی نے مسلم علاقوں کو عموماً کسی شہر کی سب سے گندی اور بدبودار بستیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ غریبی' جہالت اور بے قابو آبادی کے دباؤ سے یہ بستیاں ایک عجیب وغریب طلسم تعمیر کرتی ہیں۔ عدم تحفظ اور فرقہ وارانہ تعصب کے باعث ان میں رہنے والے مسلمان نہ تو عام طور پر کہیں الگ' کھلی ہوئی مخلوط بستیوں میں مکان یا زمین پا سکتے ہیں اور نہ پانے کی سوچ سکتے ہیں۔ اس لیے سالوں سال اور نسل در نسل ان کی بڑھتی آبادی انہیں مکانوں میں بٹوارے اور دیگر سہولیات مہیا کر کے گزر بسر کرنے پر مجبور ہے۔ 1971ء میں ہندو پاک جنگ اور بنگلہ دیش کے قیام تک متوسط مسلم طبقے کی ذہنیت میں پاکستان ایک دلچسپ حیثیت رکھتا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق ایک مطالعے کے مطابق 1971ء تک وہاں سے فارغ ہونے والے زیادہ تر طالب علم پاکستان میں نوکری پانے کے خواب دیکھتے تھے۔ 1971ء کے بعد اس صورت حال میں مثبت تبدیلی آئی ہے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ سرکاری نوکریوں' تجارت اور صنعتوں میں 1971ء کے بعد مسلمانوں کا فیصد تیزی سے بڑھا ہے۔

مسلم علاقوں میں دن رات سڑک پر لوگوں کی بھیڑ اور ذرا سی سرگرمی یا اشتعال ہوتے ہی ایک بے قابو بھیڑ کے جمع ہونے کے پیچھے جو بہت سے معاشی اور سماجی اسباب موجود ہیں ان میں مسلم رہائشی علاقوں میں مناسب انسانی سہولتوں والی رہائشی اکائیوں کی کمی بھی ایک سبب ہے۔ اس مطالعہ کے دوران میں نے دو بڑے مسلم علاقوں کا انتخاب کیا اور ان علاقوں میں مسلم آبادی کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ دو علاقے الٰہ آباد میں نخاس کہنہ' اور بنارس میں مدن پورہ تھے۔ ان کا انتخاب کرنے کے پیچھے کچھ یکساں اسباب تھے۔ دونوں علاقے گنجان مسلم آبادی والے ہیں۔ دونوں کو مرکز بنا کر اگر تین چار کلو میٹر پر محیط علاقہ لیا جائے تو دونوں میں ایسے سماجی' معاشی اور سیاسی اسباب ملیں گے جو فرقہ وارانہ دنگوں کو بھڑکانے میں محرک کا کام کرتے ہیں اور ان کے علاوہ دونوں علاقے اتر پردیش کے دو نازک ضلعوں الٰہ آباد اور بنارس میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے دوران مسلم ردِّعمل کا مرکزی نقطہ ہوتے ہیں۔

نخاس کونا یا کہنہ الٰہ آباد کی پرانی آبادی والے علاقوں میں مسلم آبادی کا مرکز ہے۔ اس کے ارد گرد شاہ گنج' اٹالہ' چکیہ' مٹھی گنج' رانی منڈی' مرزا غالب روڈ یا نور اللہ روڈ جیسے علاقے ہیں

جہاں گنجان مسلم بستیاں ہیں۔ ان علاقوں میں بیڑی بنانے والے کئی لاکھ کاریگر رہتے ہیں۔ الٰہ آباد شہر میں ٹی بی کا فیصد بھی سب سے زیادہ یہیں ہے۔ بیشتر گھروں میں بیت الخلا اور پینے کا پانی جیسی بنیادی سہولیات یا تو ہیں ہی نہیں یا ناکافی ہیں۔ عام طور سے خاندان بڑے ہیں اور ان کے لیے ہر بچہ اضافی آمدنی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے بچوں کی تعلیم سب سے محروم شعبہ ہے۔ بچوں کو اسکول بھیجنے کا مطلب ان سے ہونے والی آمدنی سے خاندان کا محروم ہونا ہی نہیں' اپنی محدود آمدنی کا کچھ حصہ تعلیم پر خرچ کردینا بھی ہے۔ یہ بات فطری ہے کہ زیادہ تر خاندان بچوں کو کچھ بڑا ہوتے ہی بیڑی بنانے کے کام میں لگا دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان علاقوں کے زیادہ تر گھروں میں ضرورت کے مطابق جگہ نہ ہونے کی وجہ وہی ہے' جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ ان بستیوں میں رہنے والوں کے سامنے دوسری بستی میں جاکر نئے مکان بنانے کے مواقع بہت کم ہیں۔ اگرچہ کریلی اسکیم جیسی کچھ بڑی رہائشی اسکیمیں ان بستیوں کے آس پاس بنی ہیں۔ جہاں مسلمانوں کو صاف ستھرے طریقے سے نئے گھر بنانے کی سہولت ملی ہے' لیکن یہ نئے مقام' بڑھتی مسلم آبادی کا بوجھ سنبھالنے کے اہل نہیں ہیں۔ اس لیے فطری ہے کہ بڑھتی آبادی ان علاقوں میں ہی اپنی رہائش کا انتظام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر خاندان میں ہر ایک اضافہ یا تقسیم کے ساتھ 'اس کی سہولتوں میں کٹوتی ہوتی جاتی ہے۔ ان سہولتوں میں فی آدمی کے سونے کی جگہ 'بیت الخلا' پینے کے پانی جیسی بے حد بنیادی چیزیں شامل ہیں۔ اپنے سروے کے دوران مجھے ایک دردناک حقیقت کا سامنا کرنا پڑا۔ نچلے اور نچلے متوسط لوگوں کے زیادہ تر گھروں میں اتنی جگہ نہیں تھی جہاں تمام لوگ ایک ساتھ سو سکیں۔ خاص طور سے سیکس جیسے نہایت پوشیدہ عمل کے متعلق کسی پوشیدہ اور باعزت حالت کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ زیادہ تر گھروں میں لوگ قسطوں میں سوتے ہیں' اس لیے ہر وقت گھر کے کچھ نہ کچھ افراد باہر رہتے ہیں اور کچھ سوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان محلوں میں ہر وقت سڑکوں پر جم گھٹ سا لگا رہتا ہے۔

بنارس شہر میں مدن پورہ کی بھی حالت کم و بیش ایسی ہی ہے۔ اس کے آس پاس بھی گھنی مسلم آبادی والے علاقے ہیں۔ گودولیہ چوراہے سے لنکا جانے والی سڑک کے دونوں طرف شہر کے سب سے گھنی آبادی والے علاقے ہیں۔ ان میں ہندو اور مسلم دونوں علاقے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں طرف کی آبادی اپنے اپنے علاقوں میں سمٹی ہوئی ہے یہاں کی مسلم

آبادی روزگار کے لیے ساڑی بنانے والے کرگھوں پر انحصار کرتی ہے۔ یہاں بھی ہر بچہ خاندان کے لیے اضافی آمدنی کا ذریعہ ہے اور بچے کو اسکول بھیجنے کا مطلب اس آمدنی سے تو محروم ہونا ہی ہے، مزید یہ کہ محدود آمدنی میں سے بھی کچھ خرچ کرنا ہے۔ اس لیے عام طور سے تعلیم کے لیے زیادہ جوش نہیں ہے۔ مکانوں کے لیے فی آدمی میسر جگہ اور ان علاقوں کو چھوڑ کر نئے علاقوں میں مکان بنانے کے متبادل بھی یہاں اتنے ہی کم ہیں جتنے ہم نخاس کہنہ میں دیکھتے ہیں۔ نتیجتاً نخاس کہنہ کی طرح ہی مدن پورہ کے آس پاس بھی سڑک پر ہر وقت چھوٹے چھوٹے گروہوں میں لوگوں کا ہجوم دیکھا جا سکتا ہے۔

نخاس کہنہ اور مدن پورہ میں ہر وقت موجود رہنے والی بھیڑ 'فرقہ وارانہ فسادات کے ہمارے مطالعے میں عمرانیاتی تجزیے کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ یہ بھیڑ کئی طرح کی سماجی سرگرمیوں میں اپنے فرقے کی عملی شرکت کو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً الہ آباد میں سروے کے دوران ایک دلچسپ حقیقت میرے علم میں آئی کہ کیرم بورڈ اور رات کے کرکٹ میچ میں مسلمان لڑکوں کی شرکت اور مہارت ہندو لڑکوں کے مقابلے بہت زیادہ ہے۔ اس کا سبب بہت عام ہے۔ مسلم علاقوں میں دن رات دکانوں کے سامنے کھلے چبوتروں پر کیرم بورڈ کے کھیل چلتے رہتے ہیں۔ ہر کیرم بورڈ کے پاس چار کھلاڑیوں کے علاوہ کافی تعداد میں تماش بین گھیرے کی شکل میں بیٹھے یا کھڑے رہتے ہیں۔ یہ منظر دن رات کبھی بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ صرف کھلاڑی یا تماش بین بدلتے رہتے ہیں۔ الہ آباد شہر میں سال بھر کیرم بورڈ کے ٹورنامنٹ ہوتے رہتے ہیں اور اس میں کوئی تعجب نہیں کہ زیادہ تر مقابلے مسلم لڑکے جیتتے رہتے ہیں۔ یہی حال رات کے کرکٹ کا بھی ہے۔ مسلم محلوں میں سال بھر کہیں نہ کہیں رات کا کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

مسلم علاقوں کی یہ بھیڑ فرقہ وارانہ کشیدگی کے دوران مذہبی تنظیموں یا فسادوں کا چناوی یا اس جیسا استعمال کرنے کی خواہش مند طاقتوں کے لیے کھاد کا کام کرتی ہے۔ یہ بھیڑ خاص طور سے غیر تعلیم یافتہ اور کم تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ہوتی ہے جنھیں آسانی سے جذباتی سطح پر مشتعل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے اراکین زیادہ تر بے روزگار ہوتے ہیں یا اُن کے پاس صرف تھوڑا بہت کام ہوتا ہے 'برسر روزگار افراد بیڑی بنانے' کرگھا چلانے یا اسی طرح کے کسی ایک روزگار میں لگے ہوتے ہیں جہاں پیشہ ورانہ تحفظ کی کمی ہوتی ہے اور لمبے وقت تک سخت محنت کے بعد بھی بہت کم مزدوری ملتی ہے۔ اس لیے اس بھیڑ کے دل میں سماج کے خلاف غصہ بھرا ہوتا

ہے۔ صفائی، تفریح یا ہریالی جیسی بنیادی سہولتوں کی کمی میں تعلیم اور روزگار کے تحفظ سے محروم اس بھیڑ کے ممبر فطری طور سے لاقانونیت، چڑچڑے پن اور غصے جیسی اعصابی کمزوری کے ساتھ ساتھ حکومت سے بیزاری کے جذبات رکھتے ہیں اور اشتعال کے کسی بھی سبب کے موجود ہوتے ہی ان کا ردّعمل جارحانہ ہوتا ہے۔

اس حالت سے ہندوستانی معاشرہ تب ہی نجات پاسکتا ہے جب مسلمان گنجان اور ناہموار آبادیوں سے باہر نکلیں اور مخلوط آبادی والی بستیاں بسائی جائیں۔ اس طرح کا عمل 1971ء کے بعد شروع بھی ہوا، لیکن اوّل تو اس طرح کی مخلوط آبادی والے علاقوں کی تعداد بہت کم ہے۔ دیگر یہ کہ مسلسل ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے زیادہ تر شہروں میں اس عمل کو اُلٹ کرر کھ دیا ہے۔ کئی مقامات پر ایک بار بڑی تعداد میں مخلوط آبادی میں بس جانے کے بعد عدم تحفظ کی وجہ سے مسلمان واپس اپنی جھونپڑپٹیوں میں چلے گئے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے سبب نقل مکانی جیسے موضوع پر ہم اسی باب میں آگے غور کریں گے۔

مذکورہ بالا سطور میں ہم نے بھیڑ اور فرقہ وارانہ فسادات کے رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں صرف ایک بات اور کہی جاسکتی ہے کہ ایک بار تشدد پر آمادہ ہو جانے کے بعد بھیڑ پوری طرح دلیلوں اور عقل سے دور ہو جاتی ہے۔ اس کا برتاؤ ہسٹریا کے جنونی مریض کی طرح ہو جاتا ہے۔ بھیڑ کے ارکان بالترتیب اپنی انفرادیت کھو کر ایک گروہ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ بو، لمس، سماعت اور نظر جیسے حواس بھیڑ کا حصہ بن جانے کے بعد آدمی کو اپنی انفرادیت چھوڑ کر ایک بڑے گروہ کی شناخت میں گم یا ضم ہو جانے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔

ہندوستانی پس منظر میں ہندو اور مسلمان بھیڑ کا برتاؤ اور اس کے تعلق سے پولیس کا ردّعمل الگ الگ ہوتا ہے۔ طلباء، مزدوروں اور تاجروں جیسے منظم گروہ، مشتعل و ضابطہ شکن بھیڑ میں تبدیل ہو کر پولیس پر حملے کر سکتے ہیں اور پولیس بھی انھیں دبانے کے لیے زیادہ قوت کا استعمال کر سکتی ہے۔ لیکن دونوں کے اس برتاؤ میں اس وقت ایک خاص فرق دکھائی دیتا ہے، جب بھیڑ خاص طور پر مسلم طلباء، مزدوروں یا تاجروں کی ہو، دونوں کے برتاؤ میں حریفانہ بے اعتمادی صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس بے اعتمادی کے اسباب پر ہم آگے غور کریں گے۔ اس جذبے کا اثر دونوں کے ردّعمل میں دکھائی دیتا ہے۔ جہاں مسلم بھیڑ پولیس کی ہر کارروائی کو منفی شکل میں دیکھتی ہے، وہیں پولیس کا ردّعمل بھی عام طور سے انتہائی شدت آمیز ہوتا ہے۔

مرادآباد (1980ء) میں عیدگاہ میں موجود مسلم بھیڑ کا برتاؤ اور اس کے ردِّعمل میں پولیس کے ذریعہ کی گئی طاقت کا استعمال' اس رجحان کی ہی ایک مثال ہے۔ وہاں عید کی نماز کے لیے جمع لوگوں کے ذریعہ عیدگاہ میں سُور کے گھس آنے کے لیے پولیس کو جواب دہ پانے اور کچھ نمازیوں اور پولیس عملے کے بیچ ہوئی بحث پر فریقین کے مشتعل ہونے سے ایسی حالت پیدا ہو گئی کہ پولیس کی گولی باری میں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ اگر وہاں ہندوؤں کا مذہبی مجمع ہوتا تو ممکن تھا دونوں فریقوں کا ردِّعمل ایسا نہ ہوتا۔

(۵)

فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کے گنجان بستیوں میں رہنے کے رجحان کو اور زیادہ مضبوط کیا ہے۔ حصول آزادی کے بعد 1960-61ء تک فسادات کی کمی ہونے اور آہستہ آہستہ ایک ایسے متوسط مسلم طبقے کے ابھار سے' جس میں سرکاری افسران' تاجر' صنعت کار' ڈاکٹر' وکیل جیسے پیشہ ور لوگ شریک تھے' وہ کمی پوری ہو گئی' جو تقسیم وطن کے بعد اس طبقے کے بڑی تعداد میں پاکستان چلے جانے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے مسلم معاشرے میں ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا' جو تنگ اور گندی گلیوں سے نکل کر کھلے' صاف ستھرے علاقوں میں رہنا چاہتے تھے۔ مختلف سرکاری ایجنسیوں کے ذریعہ ڈیولپ کی جانے والی رہائشی کالونیوں نے بھی اس رجحان کو ترقی دی۔ ہم اگر چھٹی اور ساتویں دہائی میں ملک میں شہروں کی آبادکاری کے میلان کا مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ اس دور میں شہروں کا جو بے تحاشہ فروغ ہوا' اس میں سب سے صحتمند خاصیت مخلوط آبادی والی بستیوں کا فروغ ہی تھا۔ صنعت کاری نے بھی اس ترقی میں مدد دی۔

اگر مخلوط آبادی والی بستیوں کا فروغ جاری رہتا تو یقیناً یہ برصغیر کے فرقہ وارانہ رشتوں کو مثبت طور پر متاثر کرنے والا سب سے اہم عنصر ہوتا۔ یہ بستیاں دونوں مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے' دونوں کو اپنے تعصب اور شکوک چھوڑنے اور ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع دیتیں۔ بدقسمتی سے 1960ء کے بعد ہندوستانی جسم میں ناسور کی طرح رسنے والے فسادات نے اس عمل کو نہ صرف روک دیا ہے' بلکہ ایک طرح سے اُلٹ دیا ہے۔ نہ صرف نئی مخلوط آبادیوں کا فروغ کم ہو رہا ہے' بلکہ جن شہروں میں مسلسل فساد ہوتے رہتے ہیں'

وہاں اس طرح کی بستیاں اجڑ رہی ہیں۔ اور ان کے ہندو اور مسلم باشندے اپنے اپنے مکان فروخت کرکے 'اپنے' علاقوں میں جارہے ہیں۔

اس رجحان کا مطالعہ کرنے کے لیے میں نے میرٹھ کی شاستری نگر نامی کالونی کا انتخاب کیا۔ میرٹھ-ہاپوڑ روڈ پر گذشتہ دو دہائیوں کے دوران فروغ پانے والی کئی ہزار مکانوں کی یہ کالونی منصوبہ بند ترقی کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ سرکاری محکموں کے ذریعہ میرٹھ شہر سے متصل کھیتوں کی زمین کو ایکوائر کرکے اس کالونی کو آباد کیا گیا۔ اس میں کچھ مکان بنا کر فروخت کیے گئے اور کافی تعداد میں پلاٹ بنا کر خریداروں کو اپنے ڈھنگ سے مکان بنانے کی سہولت مہیا کی گئی۔ دہلی کی قربت ہونے اور مغربی اتر پردیش میں صنعت کے زبردست فروغ کے وسیع امکانات کی بدولت ان پلاٹوں اور مکانوں کو فروخت کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اس کالونی کے فروغ میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ دو سو سے زیادہ مسلمانوں نے اس میں پلاٹ اور مکان خرید لیے۔ یہ مسلمان وہ تھے جن کے پاس مختلف کاروباروں سے روپے جمع ہوگئے تھے اور جو اب میرٹھ کے گندے اور تنگ گلیوں والے مسلم محلوں سے نکل کر ایسی آبادی میں آنا چاہتے تھے، جہاں پارک تھے، چوڑی سڑکیں تھیں اور سیور ڈرینج جیسی جدید سہولیات تھیں۔ شروع شروع میں یہاں آکر بسنے والوں میں مشہور اردو شاعر بشیر بدر بھی تھے۔ ان سے بات کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ ابتداء میں انھیں اپنے محلّے کے مسلمانوں کے طنزیہ تیر سہنے پڑے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ جا تو رہے ہیں، لیکن انھیں لوٹ کر پھر یہیں آنا پڑے گا۔ شروع میں کم لوگ آئے، لیکن ابتدائی ہچکچاہٹ ختم ہوتے ہی وہاں بسنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ 1987ء سے پہلے شہر کے پرانے حصوں میں کشیدگی یا جھگڑا ہونے پر بھی یہ علاقہ کسی جدید نئے علاقے کی طرح اس کشیدگی سے دور رہا۔ لیکن 1987ء کے فساد نے سب کچھ الٹ دیا۔ اس محلّے کا تقریباً ہر مسلم مکان، جس میں بشیر بدر کا مکان بھی شامل تھا، ان فسادات میں حملوں کا شکار ہوا۔ سارے مکان آگ زنی، لوٹ اور توڑ پھوڑ کے شکار ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض کو چھوڑ کر یہاں کے سارے مسلم باشندے مسلم علاقوں میں واپس چلے گئے۔ تقریباً ایسی ہی حالت الہ آباد کی کریلی اسکیم کی بھی ہے۔ چاروں طرف سے مسلم آبادی سے گھری ہوئی اس مخلوط کالونی میں ہر فرقہ وارانہ کشیدگی کے بعد کچھ نہ کچھ ہندو اپنے مکان بیچ دیتے ہیں۔

اپنے صنعتی کردار کی وجہ سے احمد آباد میں 1969ء تک ایسے کافی علاقے تھے، جہاں

ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخلوط آبادی تھی۔ باپو نگر' نورنگ پورا' چمن پورا' گومتی پور' کالوپور' دریاپور ایسے ہی علاقے ہیں' جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں خصوصاً صنعتی مزدوروں کی گھنی مخلوط آبادی تھی۔ 1969ء کے فساد کے بعد ان علاقوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے لیے محفوظ علاقے تلاش کرنے شروع کر دیے۔ اگر کسی مسلم بستی میں ہندوؤں کے ایک دو مکان تھے تو انھوں نے انہیں فروخت کر کے ہندو اکثریتی بستی میں مکان خرید لیے۔ یہی مسلمانوں نے بھی کیا۔ ہر فرقہ وارانہ فساد میں یہ عمل تیز ہو جاتا تھا جو 1985ء کے فساد تک تقریباً مکمل ہو گیا۔ باپو نگر کے چاروں طرف تو تقسیم کرنے والی سڑکیں بن گئی ہیں' جن کے ایک طرف ہندو رہتے ہیں اور دوسری طرف مسلمان۔ یہاں کے باشندوں میں 'مورچہ' لفظ عام ہو گیا ہے' جس کا مطلب ان سڑکوں کے دونوں طرف میلوں تک' فساد کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے حملہ آور دستوں کا جماؤ ہو جاتا ہے۔ نقل مکانی کا شکار وہ مزدور کالونیاں بھی ہوئیں' جنھیں سرکار نے برسوں پہلے مل مزدوروں کے لیے بنایا تھا اور جن میں رہنے والے مزدور اپنے اپنے مذہب کے لحاظ سے محفوظ مقامات پر جانے کے لیے کوارٹر تبدیل کر رہے ہیں۔

بمبئی میں 93-1992ء کے بھیانک فساد نے اس کی میٹروپولیٹن سوچ کو بری طرح جھنجوڑا ہے اور وہاں بھی یہ عمل شروع ہو گیا ہے۔ اندھیری (مشرق) کی نکشلا کالونی' نرمل نگر (باندرہ مشرق) چاچا نگر' کھیرواڑی میونسپل کالونی' چار کوپ (کاندیولی) اور شمال مشرق بھانڈوپ ایسے علاقے ہیں' جہاں سے مسلمان اپنی جائیداد فروخت کر کے محفوظ علاقوں میں چلے گئے ہیں۔ اسی طرح جوگیشوری میں رادھا بائی چال' کرلا پائپ لائن روڈ' دیونگر میں رفیق نگر' سنٹرل بمبئی میں دیوری ایسے علاقے ہیں جہاں سے ہندو چلے گئے۔ جائیداد کی یہ خرید و فروخت عام طور سے نقل مکانی کرنے والوں کے لیے نقصان کا سودا رہا' لیکن جان مال کے تحفظ کے لیے یہ نقصان بھی متاثرہ لوگوں نے اُٹھایا ہے۔

نقل مکانی کے اس رجحان کو اگر موثر طور پر روکا نہ گیا تو اس سے مستقبل میں کئی قسم کے خطرناک نتائج سامنے آئیں گے۔ ہمارے معاشرے میں ایک دوسرے کے بارے میں پہلے سے ہی موجود آپسی مفاہمت کا فقدان مزید گہرا ہو جائے گا اور تعصب و نفرت میں بھی اضافہ ہو گا۔ فساد کے دوران ایک ہی فرقے کی بستیاں حملہ آوروں کے لیے بہتر نشانے کا کام کریں گی۔

(۹)

فسادات کے پس پشت تجارتی رقابت

ہمعصر ہندوستانی معاشرے میں اکثر فرقہ وارانہ فسادات تجارتی مقابلہ آرائی کے نتائج کی شکل میں بھی سامنے آتے ہیں۔ سینکڑوں سالوں سے جاری بقائے باہم کے اصول نے ایک کثیر مذہبی ہندوستانی معاشرے کے فروغ میں تعاون دیا۔ یہ معاشرہ اپنی معاشی سرگرمیوں میں کچھ اس طرح ایک دوسرے پر منحصر ہے کہ آپسی لین دین سے عاری کسی سماج کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ خاص طور پر دستکاری اور چھوٹی صنعت کے شعبے میں ہندو اور مسلمان آپسی لین دین کے بغیر پھل پھول نہیں سکتے۔ بنارس کی ساڑی، علی گڑھ کا تالا اور مراد آباد کی پیتل صنعت اسی طرح کے شعبے ہیں۔ جہاں کچے مال، دستکاری اور خرید و فروخت کے لیے ہندو اور مسلمان آپس میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ دونوں کے تعلقات کی ہلکی سی تلخی بھی پوری صنعت کو متاثر کرتی ہے۔

ان شہروں میں جہاں دونوں فرقوں کے معاشی تجارتی مفادات روایتی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں وہاں گذشتہ کچھ دہائیوں میں ایک خاص طرح کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں نے ان کے آپسی تعلقات میں اندرونی تضاد تلاش کر کے ایسے حالات پیدا کرنے شروع کر دیے ہیں، جن کے تحت کچھ لوگوں کے تجارتی مفاد کو محفوظ رکھنے یا انھیں فروغ دینے کے لیے فساد کرائے جانے لگے ہیں۔ بنارس کی ساڑی صنعت اس کی اچھی مثال ہے۔ اس صنعت میں روایتی طور پر مسلمان بنکر اور ہندو تاجر کا کام کرتے تھے۔ ہندو تاجر کچا مال دے کر بنکروں سے ساڑیاں بنواتے تھے۔ گذشتہ کچھ دہوں میں کچھ مسلم جولاہے بھی اپنی تاجرانہ صلاحیت اور محنت سے اچھے تاجر بن گئے ہیں۔ بنکروں کو ہندو اور مسلم دونوں فرقے کے تاجروں کے استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر بنارس کے کچھ برسوں کے فساد کا گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو ہم پائیں گے کہ دونوں طبقوں کے ساڑی تاجروں کی مقابلہ آرائی کئی بار تشدد کی اصل وجہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فساد میں منظم طریقوں سے مخالفین کے گوداموں میں لوٹ مار کی

گئی اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ حریف تاجروں کو فساد سے متعلق مقدموں میں پھنسادیا جائے۔

ایسی ہی کچھ صورت مراد آباد میں نظر آتی ہے۔ آزادی سے قبل یہاں کی صنعت مسلمان تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔ تقسیم کے زمانے میں بہت سے مسلم تاجر پاکستان چلے گئے اور ان کی جگہ پر کاروباری لحاظ سے چالاک اور محنتی پنجابی مہاجرین نے اس صنعت کی قیادت سنبھال لی۔ ان نئے تاجروں نے اس صنعت کو کئی گنا زیادہ فروغ دیا اور یہاں کے بنے ہوئے سامان کی بڑے پیمانے پر برآمد شروع کردی۔ ہندو اور مسلم تاجروں کی کاروباری رقابت گذشتہ کئی فسادات میں کھل کر سامنے آئی۔ اس کا نتیجہ بھی فسادات میں حریف تاجروں کے گوداموں یا کارخانوں پر منظم حملوں کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

اس مطالعے کے دوران مجھے احمد آباد میں فساد کو بھڑکانے میں زمین مافیا کے ذریعہ ادا کئے جانے والے کردار کا پتہ چلا۔ بلڈر لابی کے نام سے معروف یہ مافیا آپس میں پوری طرح سیکولر تعلقات قائم رکھتا ہے اور اس کی کارروائی کے پیچھے صرف کاروباری اسباب ہوتے ہیں۔ ان گروہوں میں اکثر ہندو ۔ مسلمان دونوں اراکین شامل ہوتے ہیں۔ احمد آباد میں بہت سے علاقے اب بھی مخلوط آبادی والے ہیں۔ 1969ء کے فساد کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہونے والے فسادات کے باعث ان علاقوں سے نکل کر ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے لیے محفوظ بستیاں تلاش کرنا شروع کردی ہیں۔ یہی لوگ بلڈر لابی کا پہلا نشانہ ہوتے ہیں۔ بلڈر لابی ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے پہلے الگ الگ رہائشی علاقہ منتخب کرتی ہے اور پھر اُسے ڈیولپ کرنا شروع کرتی ہے۔ پلاٹوں یا مکانوں کے رجسٹریشن کے دوران منظم طریقے سے شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کی جاتی ہے۔ گھبرا کر مخلوط آبادی میں پھنسے لوگ رجسٹریشن کرانا شروع کردیتے ہیں۔ ایک بار مکانوں کے بن جانے یا پلاٹوں کے ڈیولپ ہو جانے کے بعد اگر آسانی سے ان کی فروخت نہیں ہو پاتی تو پھر کشیدگی پیدا کی جاتی ہے اور اس طرح پھر خوفزدہ لوگ ان بلڈروں کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ بلڈر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے مذہب والوں کے لیے مکان بنائے۔ اسی طرح کشیدگی پیدا کرنے کے لیے ہندو۔ مسلم بلڈر دولت اور طاقت کے ذریعہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات میں زمین مافیا کا کردار بمبئی کے فسادات میں بڑا صاف دکھائی دیتا ہے۔ زمین کی آسمان چھوتی قیمتوں نے بلڈر لابی کو یہاں بے حساب دولت کے ساتھ ساتھ

بہتر سیاسی اور سماجی حیثیت بھی عطا کی ہے۔ کسی زمین کے ٹکڑے کو خالی کرا کے اس پر عمارتیں یا بزنس کمپلیکس بنوانے کے لیے زمین مافیا کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ 93-1992ء کے فساد میں ایسی مثالیں ملی ہیں، جب چالوں یا جھگی جھونپڑیوں کو ان کے مکینوں کے ساتھ ہی جلا دیا گیا۔ مقصد صرف ایک تھا، یعنی کسی طرح زمین صاف کرا کے وہاں نئی عمارتیں بنانا۔ دھاراوی میں کچھ ایسی جھونپڑیوں پر حملے کیے گئے، جن میں رہنے والے پہلے ہی اُسے چھوڑ کر کسی محفوظ مقام پر نکل گئے تھے اور ان میں لوٹنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ فسادیوں نے ان میں آگ لگا دی، تاکہ اس زمین پر کوئی دوسری کاروباری سرگرمی شروع کی جا سکے۔ OO

باب چہارم

فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس

(الف)

فرقہ وارانہ کشیدگی کے دوران پولیس کے کردار یا اس کی غیر جانبداری کے تعلق سے ہندوستانی سماج کی رائے بری طرح منقسم ہے۔ سماج کے الگ الگ طبقے فساد میں پولیس کے غیر جانبدار کردار کو اپنے طور سے بیان کرتے ہیں۔ اس تحقیق کے دوران خاص طور سے تین طبقوں کی رائے جاننے کی کوشش کی گئی۔ یہ طبقے پولیس ؛ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے افراد پر مشتمل تھے۔ حیرت انگیز طور پر الگ الگ تینوں طبقوں میں ان کے افراد کی رائے کم و بیش ایک جیسی تھیں ؛ یعنی ایک طبقے کے لوگ پولیس کے کردار کے بارے میں ایک جیسا ہی سوچتے ہیں۔ پولیس کو ایک طبقے کی شکل میں رکھنا عمرانیاتی مطالعے کے لحاظ سے مناسب نہیں ہے ' کیونکہ ایک جیسی وردی پہننے کے باوجود ان کے رویے اور سوچ میں معاشی ' سماجی اور جغرافیائی پس منظر کا فرق صاف نظر آتا ہے۔ پھر بھی اس تحقیق میں انھیں ایک طبقے کی شکل میں اس لیے رکھا گیا ہے کہ انہیں دی جانے والی تربیت اور ایک ڈسپلن گروہ کے طور پر ان سے مخصوص حالات میں ایک خاص قسم کے رویے کی اُمید رکھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نکسلزم یا دہشت گردی بیشتر

پولیس والوں کے لیے صرف قانون اور نظم ونسق کا 'مسئلہ' ہے۔ ان سرگرمیوں کے سماجی اور معاشی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ پوری ایمانداری کے ساتھ یہ مانتے ہیں کہ اگر سختی سے نظم ونسق نافذ کر دیا جائے تو اس 'مسئلے' سے نجات پائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح فرقہ پرستی بھی ان کے لیے قانون اور نظم ونسق کا ہی معاملہ ہے۔

اس مطالعہ کے دوران ملازمت پیشہ اور سبکدوش تقریباً 50 پولیس والوں سے گفتگو کی گئی۔ اس سلسلے میں کچھ کو سوالنامے بھیجے گئے اور کچھ سے روبرو گفتگو ہوئی۔ جن لوگوں سے انٹرویو لئے گئے ان میں جناب رستم جی' جناب این ایس سکسینہ اور جناب جے ایف ریبیرو جیسے افسران بھی شامل ہیں' جنھیں ہندوستانی پولیس کے تھنک ٹینک کہہ سکتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر یہ لوگ مسلسل لکھتے رہے ہیں۔

اس مطالعہ کے دوران اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کے فسادزدگان کے لیے ایک جیسا سوالنامہ تیار کیا گیا۔ سوالنامہ تیار کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ فسادزدگان عام طور سے سماج کے سب سے کمزور طبقے کے افراد ہوتے ہیں۔ معاشی اور سماجی پسماندگی ان کی تعلیمی سطح پر بھی جھلکتی ہے۔ اس لیے سوالنامے میں علمی پیچیدگی کے بغیر سوالات سیدھے سادے ڈھنگ سے پوچھے گئے اور جواب بھی ہاں یا نہیں میں مانگے گئے۔ ضمیمہ 'الف' میں دیے گئے سوالنامے کا پہلا سوال فسادزدگان کے دل میں پولیس کی شبیہ سے متعلق تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کو کس شکل میں پاتے ہیں' تو اکثریتی فرقے یعنی ہندوؤں اور اقلیتی فرقے یعنی مسلمانوں اور سکھوں کا خیال ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ جہاں سو فیصد ہندوؤں نے پولیس کو فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اپنے دوست کی شکل میں پایا' وہیں تقریباً سو فیصد (استثنیٰ کو چھوڑ کر) مسلمانوں اور سکھوں کا خیال تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس ان کے ساتھ دشمن جیسا برتاؤ کرتی ہے۔ پولیس کو دوست بتانے والے ہندوؤں میں سے بیشتر فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ دیگر حالات میں پولیس کو یہ درجہ نہیں دیں گے۔ مثلاً سڑک پر ٹریفک اصولوں کی خلاف ورزی کرتے وقت ٹریفک کانسٹبل کے ذریعہ بھدی زبان کا استعمال کرنے یا تھانے میں رپورٹ لکھوانے کے موقع پر نظر انداز اور بے عزت کئے جانے جیسے روزمرہ کے تجربات کی وجہ سے ایک عام ہندو یا ایک عام مسلمان کا پولیس کے لیے یکساں جذبہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک بدبختانہ صورت

حال ہے کہ عام حالات میں ملک کا کوئی طبقہ 'پولیس کو دوست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ جبکہ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ملک کی اکثریت 'پولیس کو دوست تسلیم کرنے کو کیسے تیار ہو جاتی ہے۔ اس حالت کو سمجھنے کے لیے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کے ردّ عمل کے مختلف پہلوؤں پر گہرائی سے نظر ڈالنا ہوگی۔ آئندہ ہم فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کے ذریعہ استعمال کی جانے والی طاقت' فسادات کے دوران کی جانے والی گرفتاریوں' انسدادی کارروائیوں' حقائق کی رپورٹنگ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ جیسے شعبوں کی جانچ کرکے ان اسباب کی نشاندہی کرنے کی کوشش کریں گے 'جن کے سبب ایک ہی حالت میں پولیس اکثریتی فرقے کو دوست محسوس ہوتی ہے اور اقلیتی فرقے کو دشمن۔

سوالنامے کا دوسرا سوال' فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کے پاس مدد کے لیے جانے سے متعلق تھا۔ اس سوال کا جواب پہلے سوال کے جواب سے وابستہ ہے۔ جن لوگوں کا خیال پولیس کے متعلق دشمن کا تھا' وہ فرقہ وارانہ فساد کے دوران پولیس کے پاس مدد مانگنے کے لیے جانے کو تیار نہیں تھے۔ یہ پوچھے جانے پر کہ کیا فرقہ وارانہ فسادات کے دوران وہ مدد کے لیے پولیس سے رابطہ قائم کریں گے؟ صدفی صد ہندوؤں نے 'ہاں' میں جواب دیا۔ جب کہ مسلمانوں اور سکھوں میں زیادہ تر کا جواب 'نا' میں تھا۔ ہم اس جواب میں پوشیدہ خطرناک نتائج کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ فسادات کے دوران پولیس حکومت کے واحد ہتھیار کے طور پر سڑک پر موجود ہوتی ہے۔ ایک سہل اور فطری ردّ عمل کے طور پر ملک کے کسی شہری کو جان یا مال کے خطرے میں پڑتے ہی سب سے پہلے پولیس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر شہریوں کا کوئی طبقہ پولیس پر اعتماد نہ رکھتا ہو تو اس بات کا خطرہ ہمیشہ قائم رہے گا کہ اس طبقے کا ملک پر ہی بھروسہ ختم ہو جائے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال ہوگی۔ ملک کے ذریعہ تحفظ نہ دیے جانے کے خطرناک نتائج ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ ایک ننگی حقیقت ہے کہ 1984ء کے قتل عام میں مارے گئے سکھوں کے خاندان' سکھ دہشت گردی کے لیے رنگروٹ بھرتی کرنے کے سب سے زرخیز علاقے بن گئے تھے۔ اسی طرح بمبئی بم دھماکوں کے واقعات کے تجزیہ کے دوران یہ حقیقت بھی واضح طور پر سامنے آئی کہ دسمبر 93-1992 کے آغاز میں مسلمانوں کے جان و مال کے غیر معمولی نقصان اور انھیں تحفظ فراہم کرنے میں حکومت کی ناکامی نے اس واقعہ میں شریک لوگوں کو بم دھماکوں کے سہارے اپنا غصہ ظاہر

کرنے کی تحریک دلائی۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستانی خفیہ ایجنسیاں، جن میں بدنام زمانہ آئی ایس آئی سب سے نمایاں ہے، ہندوستان میں مسلسل اپنی جڑیں پھیلانے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور حکومت پر آبادی کے کسی طبقے کا اعتماد ختم ہوتے ہی انھیں اپنی جڑیں پھیلانے کے لیے زرخیز زمین آسانی سے مل جاتی ہے۔

(ب)

اس مطالعہ کے دوران اقلیتوں کے دل میں فرقہ وارانہ فسادات کے وقت پولیس کی دشمن جیسی شبیہ کے اجاگر ہونے کے اسباب کا تجزیہ کرنے سے پہلے، ہمیں اس بدبختانہ حقیقت کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ برطانوی حکومت میں ایک جدید اور منظم تنظیم کے طور پر وجود میں آنے والی پولیس سے ہندوستانی معاشرے کی توقعات عام طور پر فرقہ وارانہ ہی رہی ہیں۔ ایک اوسط ہندو یا مسلمان پولیس والا اپنے فرقے کے مفادات کے محافظ کی شکل میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ برطانوی حکومت کے اخیر نصف میں جیسے جیسے ہندوستانی سماج میں فرقہ پرستی بڑھتی گئی، بے اعتمادی اور عدم تحفظ میں مبتلا فرقہ ایک اوسط پولیس والے کو اپنے محافظ کی بڑی علامت کی شکل میں پانے لگا۔ فرقہ وارانہ تصادم کے دوران پولیس تھانے پر جانے والا ہندو یا مسلمان، اپنے ہم مذہب پولیس جوان کے ساتھ بڑی آسانی سے بات چیت کرلیتا ہے یا فساد کے دوران دیگر مذہب والے پولیس جوان کی ہر حرکت اُسے ناقابل اعتماد اور دشمنانہ محسوس ہوتی ہے۔

پولیس سے ان فرقہ وارانہ توقعات کے پیچھے اہم سبب برطانوی نو آبادیاتی حکومت کے ذریعہ اپنے وجود کے تحفظ کی کوشش کے طور پر بڑے پیانے پر ہندوستانی سماج کو فرقہ پرستی کے رنگ میں رنگنا ہے۔ فرقہ واریت میں رنگنے کے اس عمل سے سماج کے سبھی طبقے متاثر ہوئے اور فطرتاً پولیس بھی، جو خود اسی سماج کا حصہ تھی، اس عمل سے محفوظ نہیں رہی۔ بیشتر مواقع پر ہمیں پولیس کا برتاؤ سماج کی فرقہ وارانہ توقعات کے مطابق ہی ملتا ہے۔ موجودہ سماج میں اقلیتوں اور پولیس کے رشتوں کی تشریح سے پہلے ہمیں آزادی سے قبل ہندوستانی سماج میں ہونے والے دو واقعات کے مطالعہ سے اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کس طرح ہمارا

سماج ایک پولیس جوان سے اپنے فرقے کے فرقہ وارانہ مفادات کے تحفظ کی توقع رکھتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں بنگال کے مشرقی حصوں میں رُک رُک کر فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے۔ تیسری اور چوتھی دہائی تک اس تشدد کی ایک سیاسی صورت عیاں ہونے لگی تھی، لیکن اس سے پہلے یہ لڑائی خاص طور سے مذہبی کٹھ ملاؤں کے ذریعہ ایک دیہی ماحول میں سماجی اور معاشی موضوعات کے فرقہ وارانہ استعمال سے پیدا ہونے والے غم و غصّے کا اظہار تھا۔ مسلمان کاشتکاروں اور بے زمین مزدوروں کے ذریعہ استحصال کرنیوالے ہندو زمینداروں اور سود خوروں کے خلاف بھڑکنے والا تشدد مذہبی رہنماؤں کے ذریعہ مذہبی علامتوں کے استعمال کے سبب فرقہ وارانہ ہو جاتا تھا۔

بھولے بھالے غیر تعلیم یافتہ دیہاتیوں کے سماجی اور معاشی جھگڑوں کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کے اس عمل میں اُس وقت کے مشرقی بنگال کی پولیس کیا کردار ادا کر رہی تھی، اس کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ فرقہ پرست طاقتوں نے مسلم کسانوں کو ہندوؤں کے خلاف کمربستہ کرنے کے لیے دو افواہوں کا استعمال کیا۔ پہلی افواہ تو یہ تھی کہ برطانوی مہارانی اور ڈھاکہ کے نواب میں سمجھوتہ ہو گیا ہے اور ہندوؤں پر حملہ برطانوی حکومت کی ایک خدمت ہوگی۔ دوسری افواہ کے مطابق ایک معینہ وقفے کے دوران ہندوؤں پر کیے گئے حملوں کے لیے کوئی مقدمہ نہیں چلے گا۔ الگ الگ شہروں میں اس وقفے کا الگ الگ پروپیگنڈہ کیا گیا۔

ان افواہوں کا اعتبار قائم کرنے کے لیے ملاؤں نے مسلم پولیس کا سہارا لیا۔ ایک سپاہی کی اس وقت کے سماج میں جو حیثیت تھی، اس کے پیش نظر تعجب نہیں تھا کہ مشرقی بنگال کے دیہی مسلمانوں نے پولیس والوں کے ذریعہ تصدیق کرتے ہی ان افواہوں پر یقین کر لیا۔ فسادات میں جہاں اس بات کی شکایتیں ملیں کہ مسلمان سپاہیوں اور تھانیداروں نے، جن کی تعداد پولیس میں ہندوؤں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھی، تشدد کے شکار ہندوؤں کو بچانے کی کوشش نہیں کی، وہیں اس سے بھی سنگین بات یہ پائی گئی کہ مذکورہ افواہوں کو پھیلانے اور ان کی سچائی کا نقش بھولے بھالے دیہاتیوں کے دلوں میں بٹھانے کا کام مسلمان پولیس والوں نے کیا۔

ایک مقدمے کے دوران ایک دیہاتی مسلمان نے، جس پر ہندوؤں کے خلاف تشدد میں شریک ہونے کا الزام لگایا جا رہا تھا، بڑی معصومیت سے عدالت میں موجود ایک سپاہی کی طرف انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا کہ اسی نے اس کو بتایا تھا کہ ہندوؤں پر اس وقفے کے دوران کیا گیا

حملہ' قومی خدمت مانا جائے گا نیز برطانوی مہارانی اور ڈھاکہ کے نواب کے درمیان ہوئے سمجھوتے کے مطابق اس کام کے لیے عام معافی ملی ہوئی ہے۔

الٰہ آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ "لیڈر" کے مدیر سی۔وائی چنتامنی کے ذریعہ' یو پی کے چیف سکریٹری ایچ بام فورڈ کو بھیجے گئے ایک خط کے ذریعہ بھی پولیس سے اس وقت کے سماج کی فرقہ وارانہ توقعات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اس خط کے ساتھ چنتامنی نے' جو قانون ساز کونسل کے ممبر بھی تھے' کانپور کے پنڈت رگھوبر دیال بھٹ وید کا ایک طویل خط منسلک کیا ہے۔ پنڈت رگھوبر دیال ۔نے اپنے خط میں تفصیل سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح کانپور' جو ہندو تاجروں کا گڑھ ہے' آہستہ آہستہ ہندوؤں کے لیے غیر محفوظ ہوتا جارہا ہے۔ اس عدم تحفظ کا صرف ایک سبب پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کا بہت زیادہ ہونا تھا۔ ان کے مطابق شہر اور دیہات کے تھانوں میں تعینات تھانیداروں اور دوسرے افسران کی اکثریت کا مسلمان ہونا' ہندوؤں کے مفادات کے لیے نقصان دہ ہے۔ انسپکٹر جنرل آف پولیس کے ذریعہ اس سلسلے میں بھیجی گئی رپورٹ پر ان کے تبصرہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پورے یو پی کی پولیس (نہ صرف کانپور) میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شعبہ جاتی ترقی کے امتحانات اردو میں ہوتے تھے۔

درحقیقت وید رگھوبر دیال کے ذریعہ کانپور پولیس میں مسلمانوں کی اکثریت کے بارے میں ظاہر کیے گئے شکوک و شبہات' اس وقت کے ہندوستانی سماج کی پولیس سے کی جانے والی فرقہ وارانہ توقعات کی ہی دوسری شکل تھے۔ ان توقعات کے مطابق خاکی وردی پہنے ہوئے ایک پولیس جوان کو لازماً اپنے فرقے کے محافظ یا مخالف فرقے کے دشمن کی شکل میں ہی دیکھا جاتا تھا۔[1]

گذشتہ چند برسوں میں ہندوستانی سماج پر فرقہ پرستی کا رنگ وسیع پیانے پر چڑھا ہے۔ پولیس بھی فطری طور پر اس سے متاثر ہوئی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد جب سیاست ایک عظیم ملک کی تعمیر اور بے لوث خدمات جیسے اصولوں سے متاثر رہی تو پورے سماج میں ایک خاص طرح کا جوش اور حب الوطنی کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ بعد میں جیسے جیسے سیاست میں گراوٹ

---

[1] فائل 379۔ بکس 84 پولیس ڈیپارٹمنٹ 1936' ذرائع: اتر پردیش صوبائی آرکائیوز

آئی' اس کا اثر عوام اور دوسرے اداروں پر بھی دکھائی دینے لگا اور عوام شکست خوردگی کا شکار ہونے لگے۔ اس کا براہ راست اثر فرقہ وارانہ فسادات کے گراف پر دکھائی دیتا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد تقسیم کے سوال پر برپا ہوئے فسادات کو چھوڑ دیں تو مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد یہ فسادات تقریباً رک سے گئے تھے۔ پنج سالہ منصوبوں کے ذریعہ ترقی کے منازل طے کرنے والی قوم میں جنونی طاقتوں کو سر اُٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ اس دوران یہ طاقتیں کمزور ضرور رہیں، لیکن پوری طرح ختم نہیں ہو سکیں۔ جیسے جیسے سیاست اور دیگر ادارے بدعنوان ہوتے گئے اور عوام میں حب الوطنی کا جذبہ کمزور ہوتا گیا' قوم مخالف فرقہ پرست طاقتیں مضبوط ہوتی گئیں۔ 1961ء میں پہلی بار ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بار پھر سے بڑے فرقہ وارانہ فسادات کا دور شروع ہوتا ہے۔ جبل پور اور تقریباً ایک درجن دیگر شہروں کے فسادات درپیش خطرات اور ہندوستانی سماج میں بڑھتے فرقہ وارانہ جذبات کی علامت تھے۔

جیسے جیسے فرقہ پرستی کا رنگ بڑھتا گیا' فرقہ وارانہ فساد پھر سے ہندوستانی سماج میں ایک لازمی حصہ کی طرح رونما ہونے لگے۔ فرقہ پرستی کے زہر سے حددرجہ متاثر سماج نے دوبارہ پولیس سے فرقہ وارانہ توقعات وابستہ کرنا شروع کر دیں۔ بدقسمتی سے ایک اوسط پولیس جوان بھی انہیں توقعات پر پورا اترنے کی کوشش میں زیادہ سرگرداں نظر آتا ہے۔ پولیس کی بھرتی اور تربیت کے نظام میں کہیں نہ کہیں بنیادی خامی ضرور رہی ہے' جس میں وردی پہننے کے بعد بھی پولیس جوان خود کو ہندو یا مسلمان محسوس کرتا ہے۔ آزادی کے بعد بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کس طرح ہماری سوچ کو متاثر کرتی ہے اور خاکی وردی کے نیچے سے ہندو یا مسلمان کو اوپر لے آتی ہے اس کی مثالیں تقریباً ہر فساد میں مل جائیں گی۔ یہاں صرف دو تین مثالیں کافی ہوں گی۔

1984ء میں مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد اگر مختلف شہروں میں پولیس نے جان بوجھ کر لاپروائی نہ برتی ہوتی' تو سکھوں کا قتل عام ممکن نہیں ہو پاتا۔ اکثر مقامات پر یہ لاپروائی فسادیوں کے ساتھ پولیس کے سرگرم تعاون کی شکل میں بھی سامنے آتی ہے۔ اس دور میں پولیس کے ہندو ہو جانے کا ایک بڑا دردناک واقعہ مجھے کانپور میں سننے کو ملا۔ پنجابی مصنفہ اور ایک کالج کی پرنسپل ترون گجرال نے مجھے اپنے تجربات سناتے ہوئے بتایا کہ جب ان کا پورا محلہ فسادیوں نے گھیر رکھا تھا اور کسی بھی لمحے ان کے گھر پر حملہ ہو سکتا تھا تو انھوں نے پولیس کنٹرول روم کو فون کیا۔ اپنی مصیبت بتانے اور پولیس امداد بھیجنے کے لیے گڑگڑانے پر انھیں

دوسری طرف سے ایک طنزیہ جواب ملا۔ ''ہم بھی تو ہندو ہیں''۔ ایک مصیبت زدہ عورت کو دیا گیا یہ جواب اس بات کا مظہر تھا کہ خاکی وردی پہننے کے بعد بھی کس طرح ایک پولیس جوان سماج کی فرقہ وارانہ توقعات پر کھرا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔

احمد آباد (1969ء) میں ہوئے فساد کی جانچ کرنے والے جگموہن ریڈی کمیشن نے نصف درجن سے زائد ایسے معاملے شمار کروائے ہیں، جہاں پولیس تھانوں یا چوکیوں سے متصل مسلم عبادت گاہوں کو برباد کیا گیا۔ پولیس افسروں نے کمیشن کے سامنے یہ کمزور سی دلیل دی کہ فسادات میں مصروف رہنے کی وجہ سے ان مقامات پر ضروری پولیس عملہ موجود نہیں تھا، جس سے فسادیوں نے عبادت گاہوں کو برباد کر دیا۔ لیکن کمیشن ان دلیلوں سے متاثر نہیں دکھائی دیتا۔ کمیشن کے سامنے رائے کھاڑ پولیس لائن کے پاس واقع سید واڑہ کے مسلمانوں اور وہاں واقع مسجد پر پولیس جوانوں کے حملے کا معاملہ بھی آیا۔ کمیشن نے پولیس کی یہ دلیل ماننے سے انکار کر دیا کہ مسلمانوں نے پولیس لائن پر حملہ کیا تھا اور انھیں چوٹیں اسی دوران لگی تھیں[1]۔ احمد آباد میں پولیس تھانوں کے پاس ہندو عبادت گاہیں بھی تھیں، لیکن ایک بھی ایسی مثال نہیں ملی، جب پولیس عملے کی کمی سے حوصلہ پا کر مسلمانوں نے ان پر حملہ کیا ہو۔ بھاگلپور (1989ء) میں تو ایک مثال ایسی بھی ہے جہاں پولیس جوانوں نے پولیس لائن سے نکل کر اس سے متصل ایک مسلم محلے پر حملہ کر دیا اور لوٹ مار کی۔ یہ دونوں حالتیں بھی پولیس کے ایک ایسی حالت میں ہندو بنے رہنے کی مثالیں ہیں جبکہ ان سے غیر جانبداری کی توقع تھی۔

(ج)

اس مطالعہ کے دوران یہ پایا گیا کہ اقلیت کے لوگ عام طور سے پولیس کو فرقہ وارانہ فسادات کے دوران دشمن کی شکل میں پاتے ہیں۔ ان حقائق اور آزادی سے قبل کے مذکورہ بالا معاشرہ کی پولیس سے وابستہ فرقہ وارانہ توقعات کا موازانہ کریں تو صورت حال کافی واضح ہو سکے گی۔ ہم نے مشرقی بنگال کے پُر تشدد واقعات کے دوران دیکھا کہ مسلم فرقہ پرست طاقتوں کے ذریعہ افواہ پھیلانے میں پولیس کا استعمال کیا گیا۔ پنڈت رگھوبر دیال کا خط کانپور

---

[1] ریڈی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ صفحہ-173 و صفحہ-174

کے ہندوؤں کے خوف کو ظاہر کرتا ہے کہ اگر کوئی فرقہ وارانہ فساد شہر میں ہوتا ہے تو مسلم اکثریتی پولیس ان کی حفاظت نہیں کرے گی۔ یہ دونوں واقعات اس وقت کے ہندوستانی سماج میں حاوی رویے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستانی سماج میں اقلیتوں کے ذہن میں جو شبہات پل رہے ہیں، کہیں وہ اس رجحان کے فروغ کا نتیجہ ہی تو نہیں ہیں؟ اقلیتوں کا پولیس کو اپنے دشمن کی شکل میں دیکھنا کسی 'صفر' سے پیدا ہوا ہے یا اس کے پیچھے کچھ ٹھوس حقائق ہیں؟ کہیں پولیس کے اپنے رویے میں تو کچھ ایسا نہیں ہے، جس کے سبب ایک ہی حالت میں عوام کا ایک طبقہ اُسے دشمن اور دوسرا دوست ماننے لگتا ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب ہمیں فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹتے وقت پولیس کے برتاؤ، پولیس میں اقلیتوں کی نمائندگی نیز اکثریت واقلیت کے ذریعہ ایک ہی صورت حال پر پولیس سے کی جانے والی الگ الگ توقعات میں تلاش کرنا پڑے گا۔

سب سے پہلے ہم فرقہ وارانہ تشدد کے دوران پولیس کے ذریعہ اسے کچلنے کے لیے کی گئی کوششوں کا تجزیہ کریں۔ نظم ونسق کے کسی بھی دوسرے مسئلے کی طرح فرقہ وارانہ تشدد میں پولیس کی کارروائی کئی مرحلوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ تشدد سے پہلے خفیہ اطلاعات کی فراہمی، انسدادی کارروائی (جیسے سماج دشمن اور فرقہ پرست عناصر کی گرفتاریاں یا مچلکہ بھروانا)، طاقت کے مظاہرے کے ذریعہ سماج دشمن عناصر کے دلوں میں خوف پیدا کرنا اور سمجھا بجھا کر کشیدگی کے نقطے کو کم کرنے کی کوشش پہلے مرحلے میں آتی ہے۔ پولیس کارروائی کا دوسرا مرحلہ، فرقہ وارانہ تشدد بھڑک اُٹھنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس کے تحت فسادیوں پر لاٹھی اور گولی کی شکل میں طاقت کا استعمال، گرفتاریاں، کرفیو اور تشدد کے شکار لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے جیسی سرگرمیاں آتی ہیں۔ تیسرے اور آخری مرحلے میں فساد زدگان کی باز آبادکاری، فسادیوں کے خلاف قائم مقدموں کی جانچ پڑتال اور پیروی، ایک بار امن قائم ہو جانے کے بعد اس کے مستقل قیام کے لیے ضروری اقدامات اور عوام الناس کے دل میں اعتماد کا جذبہ پیدا کرنا شامل ہے۔

مذکورہ بالا تینوں مرحلوں میں اُٹھائے گئے اقدامات سے ہی پولیس کی غیر جانبداری متعین ہوتی ہے اور یہی غیر جانبداری سماج کے مختلف طبقوں سے اس کے رشتوں کی بہتر تشریح پیش کرتی ہے۔ ہندوستان میں اقلیتوں کے ذریعہ پولیس کو اپنا دشمن ماننے کے پیچھے مضمر اسباب

میں پولیس کا فرقہ وارانہ تشدد کے دوران برتاؤ اہمیت کا حامل ہے۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ کس طرح پولیس ایک ہی موقع پر اکثریت اور اقلیت کے ساتھ اس طرح پیش آتی ہے کہ ایک طبقہ اُسے دوست ماننے لگتا ہے اور دوسرا اُسے اپنا دشمن۔

(د)

گذشتہ باب میں ہم نے دیکھا ہے کہ آزادی کے بعد تقریباً سبھی بڑے فرقہ وارانہ حادثات کے دوران مرنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد نہ صرف زیادہ تھی، بلکہ بیشتر واقعات میں تو یہ 80 فیصد سے بھی زیادہ تھی۔ تباہ شدہ املاک بھی زیادہ تر مسلمانوں کی ہی تھیں۔ ان حالات میں امن و قانون قائم کرنے والی ایجنسیوں سے یہ اُمید فطری ہی ہوگی کہ گرفتاریوں اور تلاشیوں کے دوران وہ اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں اور تناسب میں ہندوؤں کی زیادہ گرفتاریاں کریں اور ان کے گھروں کی زیادہ تلاشیاں لیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوتا۔ تقریباً سبھی فسادات میں جہاں مرنے والوں میں مسلمان زیادہ تھے، گرفتاریاں بھی انہی کی زیادہ ہوئیں، تلاشیاں بھی ان ہی کے گھروں کی لی گئیں اور کرفیو بھی انہی علاقوں میں سختی سے لگایا گیا، جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ احمد آباد (1969ء)، بھیونڈی (1970ء) اور بھاگلپور 1989ء جیسے فسادات میں بھی جہاں مسلمانوں کا یکطرفہ قتل ہو رہا تھا، جب گرفتاریاں ہوئیں تو ان میں کثرت مسلمانوں کی ہی تھی۔ مندرجہ ذیل جدول سے صورتحال کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔

گرفتاریاں اور جانی نقصان		ہندو	مسلم
بھیونڈی 1970ء	قابل سماعت جرم میں گرفتاریاں	21	901
	اموات	17	50
میرٹھ (1982ء)	قابل سماعت جرم میں گرفتاریاں	124	231
15/ستمبر 1982ء تک	اموات	2	8

اسی طرح تلاشیوں میں بھی ہم پائیں گے کہ خاص طور پر مسلم گھروں کی ہی تلاشیاں ہوتی ہیں۔ ایک عام طریقہ کار یہ ہے کہ پورے مسلم محلے کو فوج یا نیم فوجی دستوں کی مدد سے گھیر

لیا جاتا ہے اور پھر پولیس اور مجسٹریٹ ان گھروں میں داخل ہوکر تلاشیاں لیتے ہیں۔ کرفیو لگاتے وقت بھی انتظامیہ اور پولیس دونوں بڑی دلچسپ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جہاں مسلم بستیوں میں کرفیو پوری سختی سے نافذ کیا جاتا ہے، وہیں ہندو علاقوں میں عام طور پر یہ اہم شاہراہوں تک ہی محدود رہتا ہے اور اندر گلیوں میں زندگی کی عام چہل پہل برقرار رہتی ہے۔ احمد آباد، میرٹھ، بمبئی اور الٰہ آباد کے مسلم فسادزدگان سے بات چیت کرتے وقت پولیس سے ان کی ناراضگی کے نمایاں اسباب میں ایک اہم سبب سامنے آیا۔ یہ شکایت ان علاقوں میں زیادہ تلخ تھی، جہاں ہندو اور مسلم رہائشی بستیاں ایک دوسرے سے متصل تھیں۔ احمد آباد اور الٰہ آباد کے فسادزدہ علاقوں میں غریب ہندو اور مسلم خاندانوں کے لیے روزمرہ کی ضرورتوں کے معاملے میں کرفیو کا مطلب الگ الگ تھا۔ اپنے مطالعہ کے دوران میں نے پایا کہ زیادہ تر گھروں میں پانی کی ضرورت عام نلوں سے پوری ہوتی ہے۔ کرفیو کے دوران جہاں مسلمانوں کو ان کے گھروں میں بند کردیا جاتا ہے، وہیں ہندو گلی کوچوں میں پانی بھرنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ اگر ہم پولیس فائرنگ میں مرنے والوں کی تعداد کا تجزیہ کریں تو ہمیں اسی طرح کے چونکانے والے حقائق ملیں گے۔ عام طور پر پولیس کی گولیوں کا شکار مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل جدول کا مطالعہ اس لحاظ سے دلچسپ ہوگا کہ ان فسادات میں بھی جہاں صرف مسلمان فرقہ وارانہ تشدد کے شکار ہوئے وہاں بھی پولیس فائرنگ میں ہندوؤں کے مقابلے انھیں کا نقصان زیادہ ہوا۔

فساد کا نام	پولیس فائرنگ میں مارے گئے لوگوں کی تعداد	
	ہندو	مسلم
بھیونڈی (1970ء)	0	9
فیروز آباد (1972ء)	0	6
علی گڑھ (ستمبر۔اکتوبر 1978ء)	0	7
میرٹھ (1982ء)	0	6

فسادات سے نمٹتے وقت پولیس کے ہندو اور مسلم آبادی کے ساتھ الگ الگ برتاؤ کے پیچھے کارفرما وجوہات کی تلاش بہت مشکل نہیں ہے۔ ایک اوسط پولیس جوان کا برتاؤ ان تمام تعصبات اور غلط فہمیوں سے متاثر رہتا ہے، جن کا اثر ایک اوسط ہندو کی سوچ کی تعمیر میں فیصلہ کن

کردار ادا کرتا ہے۔ ایک اوسط ہندو کی طرح ایک اوسط پولیس جوان بھی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان عام طور سے فطرتاً ظالم اور تشدد پسند ہوتا ہے۔ اپنے مطالعہ کے دوران میں نے بڑی تعداد میں مختلف عہدوں پر کام کرنے والے پولیس والوں سے گفتگو کی۔ جن میں کانسٹبل سے لے کر اعلیٰ عہدوں پر تعینات آئی پی ایس آفیسرز بھی شامل تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان میں سے بیشتر کا یقین تھا کہ مسلمان ظالم اور تشدد پسند ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابل اعتماد، ملک دشمن اور کٹھ ملا قیادت سے متاثر فرقہ ہے، جو ذرا سے اکسانے پر فساد شروع کر سکتا ہے۔

مطالعے کے دوران میں نے پایا کہ پولیس جوان عام طور سے اس بات پر ہم خیال تھے کہ فساد مسلمان ہی شروع کرتے ہیں۔ جب میں نے انہیں اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ فساد میں مسلمان ہی زیادہ مرتے ہیں، پھر وہ فساد کیوں شروع کریں گے؟ ان کے پاس بھی وہ تمام دلائل تھے، جن کا عام ہندو استعمال کرتا ہے۔ مثلاً ہندوؤں کے اپنے رویے میں برداشت اور اعتدال پسند ہونے اور مسلم اکثریتی علاقوں سے فساد شروع ہونے والی دلیلیں، جن کے بارے میں پچھلے باب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

یہ بات فطری ہے کہ ایک مرتبہ یقین ہو جانے کے بعد کہ فساد مسلمانوں کی شرارت سے شروع ہوا ہے، اُسے روکنے کے طریقوں کے بارے میں بھی زیادہ تر پولیس جوانوں کے دل میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فساد روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے یعنی شرارتی مسلمانوں کو کچل دیا جائے۔ جب بھی سرکار یا اعلیٰ افسران کی طرف سے فسادیوں کے ساتھ سختی اور بے رحمی برتنے کا حکم ملتا ہے تو کسی تنازعہ کے بغیر یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اس سختی اور سنگدلی کا مطلب مسلمانوں پر سختی ہے۔ سختی برتنے کی مختلف شکلوں میں گرفتاری کا مطلب مسلمانوں کی گرفتاری، تلاشی کا مطلب مسلمانوں کے گھروں میں تلاشی اور پولیس فائرنگ کا مطلب مسلمانوں پر فائرنگ ہوتا ہے۔

ہمارے تحت الشعور پر تعصبات کا کتنا گہرا اثر ہوتا ہے اور ہمارا رویہ ان سے کس قدر متاثر ہوتا ہے، اس کی ایک بڑی مثال فرقہ وارانہ فساد کے دوران پولیس والوں کے رویے میں ملتی ہے۔ ان فسادات میں بھی، جہاں پہلے لمحے سے ہی مسلمانوں کا نقصان شروع ہو گیا تھا اور جن میں ہندوؤں کے مقابلے بہت بڑی تعداد میں مسلمان مارے گئے، وہاں بھی کام کر چکے پولیس والوں سے بات کرنے پر بڑی دلچسپ ذہنیت سامنے آئی۔ فساد کے دوران تو وہ مانتے ہی رہے کہ

ساری شرارت کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔ فساد ختم ہونے کے کافی دنوں بعد بھی، جب یہ واضح ہو گیا کہ فساد میں نقصان کس کا ہوا، ان کے پاس یہ ثابت کرنے کے لیے "ناقابل تردید" ثبوت تھے کہ فساد کی پوری ذمہ داری مسلمانوں کی تھی۔ بھاگلپور (1989ء) اور بمبئی (93-1992ء) کے فسادات کے دوران کام کرنے والے کچھ پولیس والوں سے گفتگو کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ مسلمانوں ظالم اور تشدد پسند ہونے کی بات ان کی ذہنی ساخت میں اتنی گہری پیوست ہے کہ مسلمانوں کے جان و مال کے نقصانات کو حقیقتاً تسلیم کرنے کے بعد بھی ان کے پاس اس حقیقت سے صاف منکر ہو جانے کے بہت سے اسباب تھے کہ مسلمانوں کے نقصانات کے لیے کسی بھی صورت میں 'امن پسند' ہندو جواب دہ تھے۔

اکثریتی فرقہ کے پولیس والوں کی یہ ذہنیت ہی اس ردِّ عمل کے لیے ذمہ دار ہے، جس کے تحت فسادات سے نپٹتی ہوئی پولیس اقلیتی فرقے کو دشمن اور اکثریتی فرقے کو دوست محسوس ہونے لگتی ہے۔ شمالی ہندوستان کے شہروں میں یہ ایک عام نظارہ ہے کہ کشیدگی کے دنوں میں باہر سے بھیجا جانے والا پولیس عملہ مندروں، دھرم شالاؤں، ہندوؤں کے رہائشی علاقوں کے پارکوں یا ہندوؤں کے خالی مکانوں-دکانوں میں ٹھہرتا ہے۔ کرفیو کے دوران جب دکانیں بند ہوتی ہیں، انھیں ہندوؤں کے گھروں سے کھانے پینے کا سامان تیار کر کے بھیجا جاتا ہے۔ عام دنوں میں پولیس سے اقلیتی طبقہ کی ہی طرح فاصلہ بنائے رکھنے کی کوشش کرنے والا اکثریتی طبقہ، فرقہ وارانہ کشیدگی کے دنوں میں پولیس میں اپنا دوست تلاش کر لیتا ہے۔ دوست ہونے کے سبب پولیس سے ان کی یہ توقع فطری ہوتی ہے کہ پولیس ان کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کرے گی۔ اگر کہیں پولیس ان کے اوپر طاقت کا استعمال کرتی ہے تو ان کا ردِّ عمل ایک حیرت زدہ اور فریب خوردہ شخص کی طرح ہوتا ہے۔

بھاگلپور (1989ء) کے فسادات کے دوران پولیس ڈی آئی جی جناب اجیت دت کی طرف سے درج ایف آئی آر اس ذہنیت کی واضح نشاندہی کرتی ہے۔ اگر ہم اسے پڑھیں تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کس طرح قانون توڑ کر سڑک پر موجود ہندوؤں کی بھیڑ مسٹر دت کی طرف سے گولی چلانے کی وارننگ دینے پر حیرت زدہ رہ گئی اور لوگوں کی آنکھوں سے غصہ چھلکنے لگا۔ اس سلسلے میں مجھے اپنا ایک ذاتی تجربہ یاد آ رہا ہے۔ 1980ء میں الٰہ آباد کے گاڑی وان ٹولہ نامی ایک محلّے میں فساد پر آمادہ ایک ہندو بھیڑ کو منتشر نہ ہونے کی صورت میں

فائرنگ کی وارننگ دی تو میں نے پایا کہ پہلے تو اس بھیڑ نے اس وارننگ کو مذاق کے طور پر لیا' لیکن بعد میں جب میں نے ایک حولدار کو واضح طور پر فائر کرنے کا حکم دیا تو منتشر ہوتی ہوئی بھیڑ کی آنکھوں میں بے اعتمادی اور حیرت کے جذبات ابل پڑے۔

پولیس کے تحت الشعور میں پیوست یہ تصور کہ فساد کے لیے صرف مسلمان ہی ذمہ دار ہوتے ہیں اور انھیں روکنے کا واحد علاج یعنی مسلمانوں پر سختی ہی ہے' کبھی کبھی اس سختی کو بربریت کی آخری حد تک لے جاتا ہے۔ گرچہ اس طرح کی مثالیں ہر صوبے میں الگ الگ فسادات میں مل جائیں گی' لیکن یہاں صرف نمونے کے طور پر ہاشم پورہ ہی کی ایک مثال دی جا رہی ہے۔ یہ مثال اپنی خوفناکی اور بربریت میں ایک 'قومی شرم' کی شکل میں پیش کی جا سکتی ہے۔

1987ء کے دوران میرٹھ میں بھیانک فسادات ہوئے جو کئی مہینوں تک چلتے رہے۔ ان فسادات کے پس پشت گذشتہ کچھ دنوں سے میرٹھ میں پھیلی فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد کے بعض معمولی واقعات پوشیدہ تھے۔ وہاں 17/ مئی 1987ء سے بڑے پیمانے پر تشدد کے واقعات بھڑک اُٹھے۔ یہ تشدد کتنے بڑے پیمانے پر واقع ہو رہا تھا' اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے دبانے کے لیے باہر سے 50 سے زیادہ گزیٹیڈ پولیس افسران اور مجسٹریٹوں کے علاوہ پی اے سی' فوج اور نیم فوجی دستوں کی 70 سے زائد کمپنیاں فساد زدہ علاقوں میں جھونک دی گئی تھیں۔ اتنے بڑے بندوبست کے باوجود فسادات پر کئی مہینوں میں قابو پایا جا سکا۔

اس فساد سے نمٹنے والے پولیس جوان کس طرح سے مذکورہ بالا تعصب کا شکار تھے اس کی مثال ہاشم پورہ کے واقعہ سے ملتی ہے۔ فساد شروع ہونے کے پانچ دن بعد یعنی 22/ مئی کو دن میں فوج' پی اے سی اور پولیس نے ہاشم پورہ محلے میں تلاشیاں لیں۔ ہاشم پورہ' میرٹھ شہر کے وسط میں آباد ایک مسلم اکثریتی علاقہ ہے' جس میں کافی بڑی تعداد میں کرگھوں پر کام کرنے والے بنکر رہتے ہیں۔ ان بنکروں میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد روزگار کی تلاش میں آئے بہاری بنکروں کی ہے۔ تلاشی کے دوران مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر باہر بٹھا لیا گیا اور پھر ان میں سے نوجوانوں کو ایک کنارے جمع کیا گیا۔ جنھیں بعد میں پی اے سی کے ایک ٹرک میں بٹھا کر ہاشم پورہ سے سیدھے غازی آباد کی طرف لے جایا گیا۔ میرٹھ- غازی آباد کے درمیان واقع مراد نگر قصبے سے پہلے شاہراہ سے دور' گنگا نہر کے پشتہ پر کچھ کلو میٹر اندر لے جا کر پی اے سی کے جوانوں نے ٹرک پر سوار نوجوانوں کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔

بعض نوجوانوں کے نیچے اترتے ہی پولیس نے انہیں اپنی 'تھری ناٹ تھری' کی رائفلوں سے بھون کر نہر میں پھینکنا شروع کر دیا۔ شاید گولیوں کی آواز سن کر گاؤں والے وہاں اکٹھے ہونے لگے تھے یا پھر باقی نوجوانوں نے سامنے کھڑی موت کے ڈر سے ٹرک سے اترنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے ان زندہ لوگوں کو لے کر یہ ٹرک پھر غازی آباد کی طرف دوڑا۔ غازی آباد جانے کا ایک سبب شاید یہ تھا کہ پی اے سی کی جس ٹکڑی نے یہ تانڈو کیا تھا' وہ اکتالیسویں بٹالین کی تھی اور اس کا ہیڈ آفس غازی آباد میں تھا۔ اس لیے وہاں پہنچ کر وہ خود کو زیادہ محفوظ تصور کر سکتے تھے۔ اکتالیسویں بٹالین کا ہیڈ آفس غازی آباد۔ دہلی سرحد پر قومی شاہراہ پر واقع ہے۔ یہ ٹرک اس ہیڈ آفس سے تقریباً نصف کلومیٹر پہلے کچے راستے پر اتر گیا اور خاص سڑک سے تھوڑی دوری پر واقع ایک نہر پر جا کر رُکا۔ وہاں باقی لوگوں کو گھسیٹ کر ٹرک سے اتارا گیا اور انھیں بھی گولی مار کر نہر میں پھینک دیا گیا۔ اس کارروائی کے بعد ٹرک پھر تیزی سے کچا راستہ پار کرتے ہوئے بٹالین کیمپس کے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں تھوڑی دیر رُکنے کے بعد ٹرک اور اس کے سوار میرٹھ چلے گئے' جہاں وہ تعینات تھے۔

میں اس واقعے کے دوران غازی آباد کا پولیس سپرنٹنڈنٹ تھا۔ رات میں تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس واقعے کی اطلاع ملنے پر میں' ضلع مجسٹریٹ اور دوسرے افسران کے ساتھ موقعہ واردات پر پہنچ گیا۔ اس واقعے میں معجزاتی طور پر زندہ رہنے والے باب الدین نے ہمیں پوری کہانی سنائی۔ اس سے بات کرنے کے بعد میں یہ اندازہ بھی لگا سکا کہ اس ٹرک میں 25-30 لوگ ضرور موجود ہوں گے۔ مرنے والوں کے رشتہ داروں اور محلے والوں نے تو پہلے یہی سوچا کہ انھیں تھانے لے جایا جا رہا ہے' مگر کرفیو ختم ہونے کے ہفتوں گزر جانے اور سرکاری افسران اور جیلوں کے چکر کاٹنے کے بعد انھیں پتہ چلا کہ ان کے دلاروں کو اس بدقسمت دوپہر میں قانونی طریقے سے گرفتار کر کے کہیں نہیں لے جایا گیا تھا' بلکہ قانون کے رکھوالوں نے ہی قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے انہیں بے دردی سے قتل کر دیا۔ میں نے تھانہ لنک روڈ اور تھانہ مراد نگر کو قتل کی اس رونگٹے کھڑے کر دینے والی واردات کی رپورٹ درج کرنے کا حکم دیا۔ 23/ مئی 1987ء کو درج کی گئی ان رپورٹوں کی بنیاد پر آج تک کسی مجرم کو سزا نہیں دی جا سکی ہے۔

پی اے سی نے اتنا گھناؤنا اور انسانیت سوز واقعہ کیوں انجام دیا؟ میں نے 1987ء میں اور پھر بعد میں اس مطالعے کے دوران بہت سے ایسے پولیس جوانوں سے بات چیت کی جو

ان فسادات کے دوران میرٹھ میں تعینات تھے۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر وہ کون سا جذبہ تھا جس نے انھیں ایسی حرکت کے لیے حوصلہ دیا؟ کیا یہ مذہبی بدخواہی کا جذبہ تھا، جس نے اُن سے یہ وحشیانہ قتل کرائے یا کوئی اور بات تھی، جس نے انہیں راکشس بنا دیا تھا؟

ان پولیس جوانوں کی نفسیات کا تجزیہ دوسرے مقامات پر بھی پولیس اور اقلیتوں کے رشتوں کی تشریح کرنے میں ہماری مدد کرے گا۔ 1987ء میں میرٹھ میں تعینات زیادہ تر پولیس جوان یہ مانتے تھے کہ فساد مسلمانوں کی شرارت سے ہو رہا ہے۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ مسلمانوں کا دماغ چڑھ جانے سے میرٹھ ''چھوٹا پاکستان'' بن گیا ہے اور یہاں مستقل امن وامان قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ وہ ان افواہوں سے بھی بُری طرح متاثر تھے کہ میرٹھ کے ہندو پوری طرح سے غیر محفوظ ہیں اور مسلمان انہیں امن و سکون سے نہیں رہنے دے رہے تھے۔ میرٹھ کے کرفیو زدہ علاقوں کے باہر یعنی مظفر نگر، غازی آباد اور بلند شہر جیسے شہروں اور متصل دیہی علاقوں میں میرٹھ میں ہندو محلّوں کے برباد ہو جانے، ہندو عورتوں کی چھاتیاں کاٹ لینے یا مسلمانوں کے ذریعہ بچوں کو زندہ آگ میں جھونک دینے جیسی افواہیں زور وشور سے پھیلی ہوئی تھیں۔ بعد میں یہ افواہیں جھوٹی ثابت ہوئیں۔ لیکن مسلمانوں کو فطرتاً ظالم ماننے والے ہندو ذہن نے آسانی سے انھیں صحیح تسلیم کر لیا تھا۔ میرٹھ میں تعینات پولیس جوان بھی ان افواہوں سے بُری طرح متاثر تھے۔ وہ بھی یہ مانتے تھے کہ ساری شرارت مسلمانوں کی تھی اس لئے انہیں سبق سکھانا ضروری تھا۔ ہاشم پورہ کا واقعہ درحقیقت سبق سکھانے کے اسی عمل کا ایک حصہ تھا۔

ہاشم پورہ کا واقعہ ان متعدد واقعات میں سے ایک ہے جن سے ہمارے ملک میں اقلیتوں اور پولیس کے رشتے دشمنانہ بنے ہیں۔ اس عداوت کا اثر ہمیں فرقہ وارانہ کشیدگی کے دوران صاف دکھائی دیتا ہے۔ اکثر کشیدگی کے لمحات میں پولیس کی موجودگی مسلمانوں میں ایک جارحانہ ردّعمل کو جنم دیتی ہے۔ بمبئی میں دسمبر 1992ء میں بابری مسجد کے مسمار ہونے کے بعد مسلمانوں نے اِکاّ دُکاّ پولیس والوں پر حملے کئے اور کچھ کو مار بھی ڈالا۔ کچھ فسادات ایسے بھی ہوئے ہیں جن میں شروعات تو پولیس۔مسلم تصادم سے ہوئی اور بعد میں وہ ہندو۔مسلم تصادم میں تبدل ہو گئے۔ مراد آباد (1980ء) کا فساد اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔

مسلمانوں سے دشمنانہ تعلقات کی سب سے دلچسپ مثال فرقہ وارانہ کشیدگی کے

دوران اس وقت نظر آتی ہے جب کوئی پولیس ٹکڑی مسلم علاقوں میں تلاشی یا گرفتاریوں کے مقصد سے جاتی ہے۔اس ٹکڑی کی تیاری 'احتیاط' ہتھیار یا بریفنگ اس طرح کی ہوتی ہے جیسے وہ کسی دشمن کے علاقے میں داخل ہونے جارہے ہوں۔ میرا ایسی کئی ٹکڑیوں سے سابقہ پڑا ہے اور میں نے ہمیشہ انہیں ایسے مشتبہ اور خوفزدہ لوگوں کا گروہ پایا ہے جو پوری احتیاط کے ساتھ "دشمن" کے علاقے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ یہ احتیاط غیر ضروری بھی نہیں ہے۔ ان پر کبھی بھی حملہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اس باہمی بے اعتمادی کے لیے ذمہ دار کون ہے؟ اس صورتحال کے بیج پولیس کنٹرول روم یا تھانوں میں امن و قانون کے لیے میٹنگیں کررہے پولیس افسران کے ذریعہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے استعمال ہونے والے لفظ 'وہ' اور 'ہم' میں پوشیدہ ہیں۔

(۵)

حقائق کی رپورٹنگ کرتے وقت بھی پولیس کے برتاؤ کا ایک ایسا پہلو اُجاگر ہوتا ہے' جس پر فرقہ وارانہ تعصب کا نقش بہت واضح دکھائی دیتا ہے۔ یہ رپورٹنگ کئی سطحوں پر ہوتی ہے۔ پولیس تھانوں سے لے کر خفیہ شعبے (انٹلی جینس یونٹ) تک تیار ہونے والے ریکارڈوں اور اعلیٰ افسران وانتظامیہ کو بھیجی جانے والی رپورٹوں تک اطلاعات جمع کرنے اور انہیں جاری کرنے کے کئی مرحلے ہیں' جہاں یہ عصبیت کام کرتی ہیں۔ مثلاً اترپردیش پولیس میں رہتے ہوئے مجھے فرقہ پرست عناصر سے متعلق مختلف سطحوں پر پیش کئے جانے والے ریکارڈ میں ایک دلچسپ چیز دیکھنے کو ملی۔ زیادہ تر سطحوں پر فرقہ پرست غنڈوں یا فرقہ پرستی پھیلانیوالے عناصر کی فہرست سے مراد مسلم فرقہ پرستی میں ملوث لوگوں سے ہے۔ ان دنوں جب رام جنم بھومی تحریک کے ذریعہ سے بڑے پیمانے پر ہندو فرقہ پرست طاقتیں سرگرم تھیں' سماج دشمن عناصر کی فہرستوں میں ہندو فرقہ پرست عناصر کا نام بتانا مشکل ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اس کے پس پشت بھی وہی جذبہ کارفرما ہے جس کے تحت یہ مانا جاتا ہے کہ فرقہ پرستی پر مسلمانوں کی اجارہ داری ہے اور ہندو عام طور سے سیکولر ہوتے ہیں۔

رپورٹنگ کی سطح پر یہ تعصب پولیس کی پیشہ ورانہ مہارت کو کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے' اس کی سب سے بڑی مثال بابری مسجد کی مسماری کے واقعہ سے ملتی ہے۔ سی بی آئی کے ذریعہ

داخل کی جانے والی فرد جرم سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسجد توڑنے سے پہلے نہ صرف منصوبہ بنایا گیا تھا' بلکہ تیاریاں بھی کی گئی تھیں۔اس کے برخلاف واقعہ سے قبل کی رپورٹوں میں تقریباً سبھی خفیہ ایجنسیوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور وہاں ہندتووادی طاقتوں کے ذریعہ ہونے والی کارسیوا صرف علامتی ہوگی۔

حقائق کو چھپانے اور توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی ایک سنگین مثال ہمیں بھاگلپور (1989ء) کے فساد کے دوران بھی ملتی ہے۔ 27/اکتوبر 1989ء کو لوگائیں گاؤں میں 116 مسلمان مارے گئے۔ان سبھی کا قتل وحشیانہ طریقے سے لوگائیں گاؤں اور آس پاس کے گاؤں سے آئے ہندوؤں نے کیا۔لوگائیں' بھاگلپور ضلع ہیڈکوارٹر سے تقریباً 26 کلومیٹر اور اپنے تھانے جگدیش پور سے تقریباً 4 کلومیٹر دور ہے۔ قتل کیے گئے 116 مسلمانوں کو الگ الگ گڑھوں میں دبادیا گیا۔گاؤں کی مجموعی 181 افراد کی مسلم آبادی میں سے 65 لوگ جان بچا کر الگ الگ مقامات پر بھاگ گئے' جن میں سے کچھ بھاگلپور شہر بھی پہنچے۔ حملہ آور بھی مختلف مقامات سے تعلق رکھتے تھے' وہ بھی واردات کے بعد الگ الگ مقامات پر چلے گئے۔ دونوں فرقوں کی آبادیوں میں اس وحشیانہ قتل وغارتگری کی خبریں بھی پھیلیں اور قومی ومقامی اخبارات کی زینت بھی بنیں۔اس کے باوجود بھاگلپور کی ضلع انتظامیہ ایسے کسی واقعے سے اس وقت تک انکار کرتی رہی' جب تک اجیت دت نامی ایک ڈی آئی جی نے گوبھی کے کھیتوں میں سے 8/دسمبر 1989ء کو لاشیں نکلوانے کا کام شروع نہیں کر دیا۔

بھیونڈی' جلگاؤں (1970ء) کے فسادات کی جانچ کر رہے جسٹس مدان کمیشن نے رپورٹنگ کے دوران ظاہر ہونے والی فرقہ وارانہ نفسیات کی کئی مثالیں دی ہیں۔ بھیونڈی میں فساد بھڑک اُٹھنے کے بعد بھی جلگاؤں میں پوری احتیاط نہ برتے جانے کے متعلق جسٹس مدان کی رائے بڑی واضح ہے:

> ''......افسران کے ذریعہ اُٹھائے گئے اقدامات کی کمی کے پیچھے خاص سبب کچھ افسران کی فرقہ وارانہ نفسیات اور کچھ کی نالائقی تھی...... بدقسمتی سے پولیس سپرنٹنڈنٹ ایس ٹی رمن کا دماغ فرقہ پرستی سے بھرا ہوا تھا اور شاید وہ جن سنگھ کی طرف مائل تھا۔اس کی اپنی رپورٹوں اور جلگاؤں سٹی پولیس تھانے کے انسپکٹر انچارج ساونت کی رپورٹوں پر اس

کی تنقید سے یہ ظاہر ہے کہ وہ معاملے کی نزاکت سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کے باوجود اس نے آنکھیں بند رکھنا مناسب سمجھا' یہاں تک کہ 29 مارچ 1970ء کی اپنی رپورٹ کے ذریعہ سرکار اور ایس ایس پی کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔" [1]

رپورٹنگ میں اسی طرح کا فرقہ وارانہ امتیاز' کمیشن نے پولیس ایس پی (پی ایس آئی) بھالے راؤ کے برتاؤ میں پایا ہے' جس کے سبب ہندوؤں کی طرف سے کئے گئے پتھراؤ کے واقعات پولیس تھانے میں درج نہیں ہو پائے۔ خفیہ محکمے کے افسران نے بھی اس فساد کے تعلق سے اسی نفسیات کا مظاہرہ کیا۔ پی ایس آئی بڑگوجر نے ڈی آئی جی (آئی این ٹی) کو بھیجی گئی رپورٹ میں یہ سراسر غلط واقعہ بیان کیا کہ مذکورہ فساد مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے گھروں پر جلتی مشعلیں پھینکنے سے شروع ہوا۔ [2]

احمد آباد (1969ء) میں مسلمانوں کے نقصان کا اندازہ صرف اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ سرکاری طور پر کل 512 مرنے والوں میں سے 430 مسلمان تھے اور 24 ہندو۔ اسی طرح فساد میں تباہ تقریباً 7 ہزار دکانوں اور مکانوں میں 6500 سے زائد مسلمانوں کے تھے۔ یہ بات فطری ہے کہ مسلمانوں کو اتنا بڑا نقصان پہنچانے کے لیے فرقہ پرست ہندو تنظیموں نے کافی پہلے سے تیاری کی ہوگی۔ فساد سے متعلق مقدموں کی تفتیش کرنے والی ایجنسیوں کے برتاؤ میں بھی فرقہ وارانہ عصبیت کا رجحان صاف نظر آتا ہے۔ مذکورہ بالا سطور میں ہاشم پورہ (میرٹھ 1989ء) کا ذکر آیا ہے' جس میں ایک بہت ہی وحشیانہ 'غیر پیشہ ورانہ اور منفرد کیس کے معاملے میں تفتیش مکمل کرنے میں اتر پردیش کی سی آئی ڈی کو 8 سال لگ گئے۔ 1984ء کے سکھ مخالف فسادات کی تفتیش' فرقہ وارانہ تعصب کی دوسری مثال کے طور پر لی جا سکتی ہے۔ بیشتر واقعات میں مختلف ریاستوں کی پولیس قصورواروں کے خلاف کارروائی کرنے میں ناکام رہی ہے۔

اس سلسلے میں لال بہادر شاستری نیشنل ایڈمنسٹریٹیو اکیڈمی' مسوری کا ایک مطالعہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ میرٹھ (1982ء) میں فساد کے دوران جو ایف آئی آر درج ہوئی تھیں' ان

---

[1] مدان تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ' صفحہ 160

[2] مدان تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ' صفحہ 107-108

میں 18 قتل یا اقدام قتل سے متعلق تھیں۔ یہ سب سے سنگین دفعات مانی جا سکتی ہیں، کیونکہ دوسرے مقدمے بہ نسبت چھوٹے جرائم یا انسدادی کارروائیوں سے متعلق تھے۔ ان 18 ایف آئی آر کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے حصے میں وہ مقدمے رکھے جن میں مبینہ طور پر مسلمان حملہ آور تھے اور دوسرے حصے میں وہ معاملے تھے جن میں ہندوؤں کے حملہ آور ہونے کا شک تھا۔ دونوں معاملوں میں گرفتاریوں کا جدول اس طرح ہے۔

جن معاملوں میں مبینہ طور پر مسلمان حملہ آور تھے				جن معاملوں میں مبینہ طور پر ہندو حملہ آور تھے			
گرفتار شدگان		مرنے والے		گرفتار شدگان		مرنے والے	
ہندو	مسلم	ہندو	مسلم	ہندو	مسلم	ہندو	مسلم
23	232	2	0	0	0	0	7

مدان کمیشن نے بھیونڈی کے فساد کی تحقیقات کرنے والی خصوصی تفتیشی ٹیم کو فرقہ وارانہ تعصب کی ایک روشن مثال بتایا ہے۔ اس ٹیم نے فساد کے پیچھے مسلمانوں کی سازش ہونے کی جو بات کہی تھی، کمیشن نے اس الزام کا مذاق اڑاتے ہوئے اس کو پوری طرح بے بنیاد پایا۔ کمیشن نے ایسی بہت سی مثالیں شمار کرائی ہیں جن میں تفتیش کاروں نے ہندو مجرموں کو بچانے اور مسلمانوں کے خلاف جھوٹے ثبوت تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کمیشن کو بہت سی ایسی مثالیں ملی تھیں، جن میں تعصب کے تحت سرکاری دستاویزوں سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی[1]

گرفتار شدگان کے ساتھ برتاؤ کے معاملے میں بھی سرکاری ایجنسیوں کے رویے میں خاصا فرقہ وارانہ تعصب جھلکتا ہے۔ کسی بھی مہذب معاشرے میں یہ ایک تسلیم شدہ روایت ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص گرفتار کیا جاتا ہے تو یہ حکومت کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے اور انسانی حقوق کے مطابق اُسے وہ ساری سہولتیں مہیا کرے، جس کا وہ مستحق ہے۔ بد قسمتی سے پولیس اور جیل افسران کے ذریعہ قیدیوں کے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جو کہ محض فرقہ وارانہ تعصب کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی ہیں۔ اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے صرف چند مثالیں ہی کافی ہوں گی۔

مذکورہ بالا سطور میں ہاشم پورہ کے فسادات کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ان

[1] آئی بی آئی ڈی، صفحہ-108

فسادات میں حراست میں لیے گئے بہت سے لوگوں کا وحشیانہ قتل پی اے سی کے ذریعہ صرف اس لیے کر دیا گیا تھا' کیونکہ وہ مسلمان تھے۔ میرٹھ میں 1987ء کے اسی فساد کے دوران جب گرفتار شدہ مسلمانوں کو سینٹرل جیل فتح گڑھ لے جایا گیا تو ان کے اوپر جیل کے ملازمین و دیگر قیدیوں نے حملے کئے' جس میں چھ مسلمان مارے گئے۔ کوئی اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ ان بے یار و مددگار قیدیوں پر حملے جیل عملہ کے اکسائے بغیر کئے گئے ہوں گے۔

قیدیوں کے ساتھ برتاؤ میں فرقہ وارانہ تعصب کو سمجھنے کے لیے مدان کمیشن کی رپورٹ کے کچھ حصوں کو ایک بار پڑھنا مناسب ہوگا۔ اس کمیشن کے سامنے جو گواہیاں گزریں' ان سے کمیشن نے درج ذیل نتائج اخذ کئے:

1 - کچھ مسلم قیدیوں کی گرفتاری کے دوران اور گرفتاری کے بعد پولیس حراست میں پٹائی کی گئی۔

2 - 7 اور 8/ مئی 1970ء کو قیدیوں کو کھانا اور پانی نہیں دیا گیا۔

3 - مسلم تنظیموں کے ذریعہ الزام عائد کیا گیا کہ ان قیدیوں کو بھیونڈی تھانے کے باہر سڑک پر بغیر کسی سائے کے تیز دھوپ ہی میں بیٹھنے پر مجبور کیا گیا' جبکہ ہندو قیدیوں کو صحن میں بٹھایا گیا۔

4 - کھانا اور پانی بانٹتے وقت ہندو اور مسلم قیدیوں کے درمیان امتیاز برتا گیا۔

افسران کے ذریعہ فائر بریگیڈ کے پانی ٹینکروں کو قیدیوں کے لیے پانی لانے میں استعمال نہ کیے جانے کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ قیدیوں میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ جب کہ تعلقہ پولیس تھانے میں لگے ہوئے نل سے پانی پینے کے لیے ہندو قیدیوں کو پوری آزادی حاصل تھی۔

تیلی چیری فسادات (1971ء) کی جانچ کرنے والے جسٹس جوزف وتھاتھل نے اپنی جانچ رپورٹ میں فسادات سے نمٹنے والے پولیس جوانوں کے رویے میں فرقہ وارانہ عصبیت کو تفصیل سے نشان زد کیا ہے۔ ان کے کچھ تجزیوں کو یہاں بغیر کسی تبصرے کے بیان کرنا مناسب ہوگا:

236۔ "ڈپٹی پولیس سپرنٹنڈنٹ کی احتیاط کا ایک دوسرا سبب بھی ہو سکتا تھا۔ اُسے مسلمانوں کے بارے میں ہندو پولیس جوانوں کی سوچ کا پتہ تھا۔ اپنے بیان میں اس نے کہا کہ

گشت لگاتے وقت اُسے کچھ پولیس جوانوں کو اُس وقت قابو میں کرنا پڑتا تھا جب وہ مسلمانوں کو سڑک پر دیکھ کر اپنا ہوش کھو بیٹھتے تھے۔ نائب کلکٹر نے بھی اسی طرح کا بیان دیا تھا۔ (P15WLP-13) کچھ گواہوں نے بتایا کہ سڑک پر موجود مسلمانوں کا تعاقب کرتے وقت کچھ پولیس جوانوں نے انھیں چیخ کر پاکستان جانے کے لیے کہا۔ مٹامبرم میں ان میں سے کچھ پولیس والے مسجد میں داخل ہو گئے اور نہ صرف انھوں نے ایک باعزت شخص عثمان کنّی حاجی (PW-6) کی پٹائی' کی بلکہ مسجد کی ٹیوب لائٹ اور جھاڑ فانوس بھی توڑ ڈالے۔ ان کی اس حرکت کو جائز ٹھہرانے کے حق میں کوئی بھی ثبوت سامنے نہیں آیا۔"

245۔ "فسادات کے تیسرے دور کے کچھ متاثرین اور چشم دید لوگوں نے حلفیہ بیان دیا کہ جب یہ فساد ہوا تو قریب کھڑے پولیس جوانوں نے اسے روکنے یا اس میں شریک لوگوں کو گرفتار کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ کے پی قادر (P-28-W-1) کا کہنا تھا کہ جب اس کے گھر پر حملہ ہوا اور لوٹ مار چل رہی تھی تو وہاں سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر چار۔ پانچ پولیس کے جوان سڑک پر کھڑے تھے۔ کے پی راگھون (P-27 W2) نے بتایا کہ دوپہر کے وقت جب پونیم میں مسلم گھروں پر حملہ ہوا تو اس نے پائر تھانے میں جاکر اس کی اطلاع دی۔ لیکن پولیس جائے واردات پر پانچ بجے پہنچی۔ تب تک سڑک کنارے کے سبھی مسلم گھر لوٹے جا چکے تھے۔ شری رام داس (P1 W1) نے بتایا کہ جب اس نے تھرودنگڑ کی عائشہ منزل پر حملہ ہوتے دیکھا تو اس نے پولیس کو فون کیا' لیکن کوئی پولیس عملہ موقعہ واردات پر نہیں پہنچا۔ جب پی۔ پی منزل جل کر خاک ہو رہی تھی تو جیپ میں سوار کچھ پولیس جوان وہاں آئے اور عینی شاہد نے انہیں جیپ روک کر جلتے ہوئے مکان کا معائنہ کرنے کو کہا' تو انھوں نے جیپ روکنے سے انکار کر دیا۔"

مدان کمیشن اور جوزف وتھا یتھل کمیشن کے یہ نتائج بدقسمتی سے فرقہ وارانہ کشیدگی کے زیادہ تر حالات پر عائد ہوتے ہیں۔ اس بات کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے کہ فرقہ وارانہ تعصب کے یہ واقعات نظم و نسق قائم کرنے والی مشنری کے رویے میں ایک عام حقیقت کے بجائے استثنیٰ کی شکل میں موجود ہوں۔ OO

باب پنجم

مطالعے کے خاص نتائج

اس مطالعے کے خاص نتائج درج ذیل ہیں:

(الف) بیشتر فسادات میں پولیس کا برتاؤ جانبدارانہ رہا ہے۔ اس مطالعے میں بیان کئے گئے سبھی فسادات میں پولیس نے قانون اور نظم ونسق نافذ کرنے والی غیر جانبدار تنظیم سے زیادہ ایک 'ہندو' دستے کے طور پر کام کیا۔

(ب) طاقت کا استعمال' احتیاطی گرفتاریاں' کرفیو کے نفاذ' تھانوں میں لوگوں کے ساتھ برتاؤ' حقائق کی رپورٹنگ اور فساد کے دوران درج مقدموں کی تفتیش اور پیروی میں پولیس کے رویے میں نمایاں طور پر امتیاز دکھائی دیتا ہے۔ ان سارے معاملات میں مسلمان زیادتی کے شکار ہوتے ہیں۔

(ج) فرقہ وارانہ تصادم کے دوران پولیس کے تعلق سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سوچ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ فساد کے دوران ہندو عوام پولیس کو اپنا دوست اور محافظ پاتے ہیں' جبکہ انہی حالات میں زیادہ تر مسلمان انھیں اپنے دشمن کی شکل میں پاتے ہیں۔

(د) اوسط پولیس جوان' پولیس عملہ میں داخل ہوتے وقت اپنا تعصب اور ذہنیت نہیں چھوڑپاتا جو کہ فرقہ وارانہ تشدد کے دوران مسلمانوں سے اس کے برتاؤ کی صورت میں صاف صاف جھلکتا ہے۔

(ڈ) ہندوستانی معاشرہ ایک اوسط پولیس جوان سے فرقہ وارانہ توقعات رکھتا ہے۔ پولیس جوان کو اپنے فرقے کے مفادات کے محافظ کی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔

(ذ) پولیس اور مسلمانوں کے درمیان مخالفانہ تعلقات تصادم کی صورت میں دونوں کو شدید ردِعمل کے لیے مجبور کرتے ہیں۔

سفارشات

حکومت کی طرف سے اگر بھرپور مزاحمت نہ ہو تو فرقہ پرستی ایک ایسا مرض ہے، جو پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ نوکر شاہی کے وہ حصے بھی، جن سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کریں گے، سماج کے دوسرے طبقوں کی طرح اپنی متعصب فرقہ وارانہ ذہنیت سے آزاد نہیں ہوپاتے۔ یہ بہت غیر فطری بھی نہیں ہے۔ قانون اور نظم و نسق نافذ کرنے والی مشنری کے مختلف پرزے بھی اسی معاشرے کے مختلف طبقوں سے آتے ہیں۔ اس لیے فطری طور پر سرکاری ملازمت میں آنے کے بعد بھی وہ فرقہ وارانہ فسادات اور سماجی کشیدگی کے متعلق اپنی تنگ نظری سے آزاد نہیں ہوپاتے، جسے انھوں نے سماج کے ایک فرد کے طور پر مسلسل حاصل کیا ہے۔ حفاظتی دستوں بالخصوص پولیس کے تعلق سے یہ حقیقت بلاشبہ زیادہ مسائل پیدا کرنے والی ہے۔

پولیس میں فرقہ پرستی کے مسئلے پر روک لگانے اور اُسے ایسا برتاؤ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے کہ جس سے عوام بالخصوص اقلیتی فرقے اسے غیر جانبدار سمجھیں، یہ ضروری ہے کہ اصلاح کے لیے چند بنیادی قدم اُٹھائے جائیں۔ سب سے پہلے ہندوستانی پولیس کے اعلیٰ طبقہ کے لیے یہ قبول کرنا ضروری ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹنے میں ان کی کارکردگی شدید احتساب کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ جانبداری کے الزامات سے خود کو بری قرار دے سکتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ ایک تنظیم کے طور پر ہندوستانی پولیس کو اقلیتوں کا اعتماد حاصل نہیں ہے اور جیسا کہ اس مطالعے میں ہم پاتے ہیں کہ تقریباً تمام فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس پر نہ صرف مسلم قیادت بلکہ سیکولر میڈیا، سماجی کارکنوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ ہندوؤں کی حامی اور فرقہ پرست ہے۔ ہندوستانی پولیس کی یہ

ناکامی ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس صورت حال سے نجات پانے کے لیے کارگر اقدامات نہ صرف مؤثر ہونے چاہئیں' بلکہ انہیں اب اور زیادہ ٹالا نہیں جانا چاہئے۔

اس مطالعے کے نتائج سے چار ایسے میدان واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں' جہاں بنیادی تبدیلیوں کی فوری ضرورت ہے۔ یہ ہیں مختلف سطحوں پر پولیس کی بھرتی پالیسی' تربیت' پولیس قیادت کی جواب دہی اور فرقہ پرستی سے لڑنے میں عام لوگوں کی شرکت۔ ان چاروں کے علیحدہ علیحدہ تجزیے ضروری ہیں۔

1- پولیس میں اقلیتوں کی نمائندگی

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد مختلف پولیس عملوں میں اقلیتوں کی حصہ داری میں مسلسل کمی ہوتی جارہی ہے۔ درج ذیل جدول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کے لحاظ سے حساس صوبوں میں بھی پولیس میں اقلیتوں کی نمائندگی 5 فیصد سے بھی کم ہے' جبکہ ان ریاستوں کی آبادی میں اقلیتوں کا تناسب 12 سے 15 فیصد کے درمیان اور کہیں کہیں تو اس سے بھی زیادہ ہے۔ (ذریعہ بی پی آر اینڈ ڈی)

ریاست / مرکز کے زیر انتظام علاقے	پولیس عملے کی تعداد	مسلمانوں کی تعداد	فی صد
1۔ آندھرا پردیش	63,147	10,499	16.6
2۔ اروناچل پردیش	4,081	-	-
3۔ آسام	43,990	3,936	8.9
4۔ بہار	83,323	-	-
5۔ گوا	2,535	73	2.9
6۔ گجرات	63,092	3,897	6.2
7۔ ہریانہ	30,431	325	1.7
8۔ ہماچل پردیش	1,746	163	1.4
9۔ جموں و کشمیر	40,180	18,045	44.9

10- کرناٹک	49,322	3,557	7.2
11- کیرل	34,375	3,270	9.5
12- مدھیہ پردیش	88,673	3,720	4.2
13- مہاراشٹر	1,58,543	6,633	4.2
14- منی پور	11,032	934	8.5
15- میگھالیہ	8,271	158	1.9
16- میزورم	5,152	699	13.6
17- ناگالینڈ	14,754	145	0.9
18- اڑیسہ	36,995	1,029	2.8
19- پنجاب	63,310	210	0.3
20- راجستھان	57,167	3,221	5.6
21- سکم	2,732	07	0.2
22- تمل ناڈو	69,021	3,024	4.4
23- تریپورہ	11,161	253	2.3
24- اتر پردیش	1,63,875	8,072	4.9
25- مغربی بنگال	59,137	3,442	5.8
26- انڈمان و نکوبار جزائر	1,852	111	5.9
27- چنڈی گڑھ	4,086	06	0.1
28- دادرا و ناگر حویلی	222	05	2.2
29- دمن اور دیپ	236	05	2.1
30- دہلی	50,798	1,160	2.3
31- لکش دیپ	359	163	45.4
32- پانڈیچری	1,866	63	3.4

پولیس کے سرگرم دستے میں اقلیتوں کی ناکافی یا اکثر صفر کے برابر نمائندگی سے ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں شدید غلط فہمی تو پیدا ہوتی ہی ہے' اکثر اس سے ان کے بارے میں پولیس والوں میں مخالفانہ ردعمل بھی پیدا ہوتا ہے۔ مختلف علاقوں سے پولیس عملوں' خاص طور سے مسلح پولیس دستوں جیسے پی اے سی' بی ایم پی' ایس آر پی وغیرہ میں اقلیتوں کو اطمینان بخش نمائندگی دیئے جانے کی مانگ اُٹھائی جاتی رہی ہے۔اس کی مخالفت میں نہ صرف ہندو انتہا پسند تنظیموں بلکہ اعلیٰ پولیس افسران کے ذریعہ بھی بڑی دلچسپ دلیلیں دی جاتی رہی ہیں۔اس تعلق سے پی اے سی کے ایک کیس کا مطالعہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں اور نزاکت کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔اس فورس میں اقلیتوں خاص طور سے مسلمانوں کی نمائندگی 3 یا 4 فیصد سے زیادہ نہیں رہی ہے۔ پی اے سی کی ایک بٹالین میں عام طور سے 8 کمپنیاں ہوتی ہیں۔ ہر کمپنی میں 3 پلاٹون اور ہر پلاٹون میں 3 سیکشن ہوتے ہیں۔ عام طور سے پی اے سی کو ایک سیکشن سے کم طاقت میں تعینات نہیں کیا جاتا۔ایک سیکشن میں 7 سے 9 جوان ہوتے ہیں اور فساد کے دوران یہ ایک ہیڈ کانسٹبل کی رہنمائی میں آزادانہ کام کرتے ہیں اور بیشتر موقعوں پر ان پر کسی بھی افسر کی گہری نگرانی نہیں ہوتی۔ اگر ہم اوسط پی اے سی بٹالین میں موجود بہتر (72) سیکشنوں کا تجزیہ کریں تو پائیں گے کہ ان میں 60 سے 65 سیکشنوں میں ایک بھی مسلمان نہیں ہوتا۔اس کے نتیجے میں فورس جس طور پر عمل کرتی ہے وہ بڑی حد تک 'ہندو' عصبیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

جو لوگ پی اے سی میں اقلیتوں کی نمائندگی کو لازمی کیے جانے کی مخالفت کرتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ پی اے سی ملک کی بہترین مسلح پولیس فورسوں میں سے ایک ہے۔بی ایس ایف اور آئی ٹی بی پی جیسے نیم فوجی دستوں کے وجود میں آنے یا سی آر پی ایف کی توسیع سے قبل یہ سب سے زیادہ استعمال ہونے والا عملہ تھا۔کشمیر سے لے کر شمال مشرقی ریاستوں تک اس کا استعمال ہوا اور ہر موقع پر اس نے قابل تعریف کارکردگی انجام دی۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اتنے اچھے عملے کو غیر ضروری طور پر خود غرض عناصر کے ذریعہ دیدہ ودانستہ بدنام کیا جاتا ہے۔ خاص طور سے فرقہ پرست مسلم قیادت اس پر یوں حملہ کرتی ہے تاکہ یہ عملہ پست ہمت ہو اور اس کے ناپاک ارادوں میں رکاوٹ نہ بن سکے۔پی اے سی کا دفاع کرنے والے یہ نام نہاد عناصر ہمیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ پی اے سی کے برتاؤ میں ہندوؤں کی حمایت کا ہلکا سا جھکاؤ مراد آباد (1980ء) کی عیدگاہ کے واقعہ کے بعد دکھائی دینے لگا تھا اور یہ بھی اپنے خلاف عائد کیے گئے بے

بنیاد الزامات کا رد عمل زیادہ تھا۔ جو اپنے آپ پر ہونے والی تنقید کے خلاف ہندوؤں میں اپنے حامی تلاش کرنے کی کوشش ہے۔

یہ سچ ہے کہ 1973ء کی بغاوت سے پہلے پی اے سی نے پورے ملک میں امن و امان کی بگڑی صورت حال میں بہت اچھا کام کیا۔ خاص طور سے شمال مشرقی ریاستوں میں 'شورش کو کچلنے میں اس کا بہت اہم کردار رہا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 1960ء کے بعد اتر پردیش میں کوئی فساد ایسا نہیں ہوا جس میں سماجی کارکنوں اور حقوقِ انسانی کی تنظیموں نے پی اے سی کے کردار کو جانبدارانہ اور خاص طور سے مسلم مخالف نہ پایا ہو۔ پی اے سی فرقہ وارانہ فساد میں سب سے زیادہ نقصان اُٹھانے والی اقلیتوں کا اعتماد کبھی حاصل نہیں کر سکی۔ مراد آباد (1980) کی عیدگاہ کا واقعہ 'یقیناً پی اے سی کے تنظیمی ڈھانچوں کی خامیوں اور اس کے برتاؤ کو قومی سطح پر اُجاگر کرنے والا پہلا بڑا واقعہ تھا۔ اس کے باوجود نہ تو کسی کو سزا دی گئی اور نہ ہی اس میں تنظیمی سطح پر کوئی تبدیلی کی گئی۔ اس سے پی اے سی کا حوصلہ مزید بلند ہوا۔ اس کے بعد سال بہ سال تقریباً سبھی فسادات میں پی اے سی نے اپنی مسلم مخالف کارکردگی جاری رکھی۔ اس کی انتہا 1987ء میں میرٹھ میں اس وقت ہوئی جب پی اے سی نے ہاشم پورہ محلے میں کئی مسلم نوجوانوں کو اُٹھایا اور انہیں انتہائی وحشیانہ طریقے سے غازی آباد کے نزدیک دو مختلف مقامات پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہاشم پورہ کا واقعہ ان اعلیٰ پولیس افسروں کے لیے ایک سبق ہونا چاہیے' جو پولیس میں اقلیتوں کی نمائندگی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اقلیتوں کے لیے پولیس میں ریزرویشن کے خلاف جو دلیلیں دی جاتی ہیں' ان میں سے کچھ خاص اس طرح ہیں:

اس طرح کے ریزرویشن سے پولیس عملے میں فرقہ پرستی بڑھے گی' مذہب کی بنیاد پر چنے گئے کانسٹبل بیرکوں اور لائنس میں تشدد کریں گے اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب فرقہ وارانہ بنیاد پر چنے گئے یہ پولیس جوان اپنے سے مختلف مذہب والے افسروں کا حکم ماننے سے انکار کردیں' جس سے فورس کا ڈسپلن خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ پولیس کی یہ قیادت ایسی دلیل دیتے وقت اس حقیقت سے آنکھ چراتی ہے کہ جس عملے کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں وہ فرقہ پرستی کے زہر میں تو پہلے ہی مبتلا ہے۔ ہاشم پورہ کا معاملہ اور ایودھیا میں بابری مسجد کی مسماری اور اس کے بعد سورت اور بمبئی کے فسادات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی تنظیم میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں ہے اور ان کی پولیس اور پی اے سی کے جوانوں کا

برتاؤ سنگین طاعون میں مبتلا ہے۔اگر یہ لیڈر شپ ان حقائق کو نظر انداز کرتی ہے تو اس کا صرف ایک ہی مطلب نکالا جاسکتا ہے کہ یہ اپنی تنظیم کی اصلاح کرنے کے قطعی خواہش مند نہیں ہیں اور ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ بھی اُسی فرقہ وارانہ سوچ کے شکار ہیں، جس سے اکثریتی فرقے کے بہت سے لوگ متاثر ہیں۔

اتر پردیش میں ایک تجربہ ایسا ہوا ہے جس کے بارے میں جاننا بہت دلچسپ ہوگا اور جو صرف اس لیے ناکام ہو گیا کہ اسے عملی جامہ پہنانے والے افسر اپنا تعصب نہیں چھوڑ پائے۔ 1980 میں صوبائی سطح پر ہوئے فسادات کے دوران اُس وقت کے وزیر اعلیٰ جناب وی پی سنگھ نے یہ فیصلہ لیا تھا کہ خصوصی سیوا دَل کے نام سے پی اے سی کی کچھ ایسی بٹالین تیار کریں گے، جن میں اقلیتوں کی معقول نمائندگی ہوگی۔ جب ان بٹالینوں کو کھڑا کیا گیا تو مفاد پرستوں نے یہ طے کیا کہ ان میں بھی پی اے سی کی عام بٹالینوں کی طرح مسلمانوں کی نمائندگی 3 سے 4 فیصد تک ہی رہے۔ نتیجتاً یہ ساری کوشش ہی ناکام ہو گئی اور اس کے نتائج بھی بہت حیرت انگیز نہیں رہے۔ 1987ء میں میرٹھ کے ہاشم پورہ محلّے سے مسلم نوجوانوں کو اغوا کر کے انھیں وحشیانہ طریقے سے مارنے والے جوان انہی خصوصی سیوا دَل بٹالینوں میں سے ایک '41ویں بٹالین' سے تھے، جو کہ اقلیتوں کے تحفظ اور انہیں مناسب نمائندگی دینے کے غرض سے کھڑی کی گئی تھی۔ مسلح پولیس بٹالینوں کے سرگرم گروپوں میں اقلیتوں کی نمائندگی (زیادہ تر مسلح پولیس عملوں میں ایک سیکشن اور کچھ میں آدھا سیکشن) کی کمی نے زیادہ تر پولیس تنظیموں کے برتاؤ میں اس جیسی مجرمانہ اور غیر پیشہ ورانہ خامیاں پیدا کی ہیں۔ اس طرح کی مثالیں تو بہت ہیں، لیکن یہاں کچھ ہی کا ذکر کافی ہوگا۔

بھاگلپور (1989ء) کے فسادات کے دوران 100 سے زائد مسلم فسادزدگان فوج کے ذریعہ بہار پولیس کی ایک ٹکڑی کو سونپے گئے، جس کی قیادت ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر کر رہا تھا۔ لوگائیں گاؤں کے یہ فسادزدگان بعد کو اپنے "محافظوں" کے ذریعہ جان بوجھ کر برتی گئی لاپرواہی کے سبب مارے گئے۔ بابری مسجد گرنے کے بعد ہوئے بمبئی کے فسادات میں پولیس کنٹرول روم سے ہندو فسادیوں کو اکسانے والے وائرلیس پیغام ایک سماجی کارکن ٹیسٹا شیتل واڈ کے ذریعہ ریکارڈ کیے گئے اور جو بعد میں بہت سے اخبارات میں شائع بھی ہوئے۔ بھیونڈی کے فسادات (1970) کے دوران تلاشیوں، گرفتاریوں اور تفتیش کے سلسلے میں تعصب انتا عیاں تھا کہ ان

فسادات کی جانچ کرنے والے عدالتی کمیشن نے مجبوراً پولیس کے خلاف بہت شدید نکتہ چینی کی۔

مختلف پولیس تنظیموں میں اقلیتوں کی نمائندگی میں اضافہ سے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کے رویے میں دو قسم کی اصلاح ہوگی۔ ایک تو پولیس میں زیادہ مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کی بحالی کر کے پولیس جوانوں کو مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں بہتر آپسی مفاہمت پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ ایک ہی بیرک میں رہتے ہوئے، ایک لنگر میں کھانا کھاتے ہوئے، ایک میدان میں کھیلتے ہوئے یا ایک ہی جیسی ڈیوٹی ساتھ ساتھ انجام دیتے ہوئے مختلف مذاہب کے پولیس جوانوں کے درمیان خاص طرح کے بھائی چارے کا جذبہ پیدا ہوگا اور اس سے ایک دوسرے کے متعلق دل میں پلنے والی عصبیت اور بندشوں سے بھی نجات ملے گی۔ محض ساتھ ساتھ رہنے سے ہی ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں بہتر سمجھ پیدا ہوگی۔ دوسرے، سرگرم پولیس فورسوں (سیکشن، پلاٹون یا کمپنی) میں اقلیتوں کی نمائندگی فسادات سے نمٹنے کے ان کے طور طریقوں پر بھی انتہائی فیصلہ کن اثر ڈالے گی۔ ایسی سرگرم پولیس فورس جس میں مختلف اعتقادات کی شمولیت ہو، گرفتاریوں، طاقت کے استعمال یا گرفتار لوگوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں اس طرح کا امتیاز نہیں کرپائے گی جیسا ہم اس مطالعے کے دوران جا بجا پاتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ میں مختلف نسل وذات کے افراد کو پولیس فورسوں میں نمائندگی دیے جانے کا کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے۔ سیاہ فام، ایشیائی نسل اور آئرش لوگوں کی نمائندگی میں اضافہ سے اوسط گورے امریکی یا انگریز پولیس جوان کو تعصب ترک کرنے اور اقلیتوں سے نمٹتے وقت اپنے رویے کو بہتر بنانے میں مدد ملی ہے۔

میرا مشورہ ہے کہ اقلیتوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے پولیس فورس میں نمائندگی ملنی چاہیے۔ اقلیتوں کی نمائندگی، پولیس فورس میں کم از کم 10 سے 12 فیصد ہونی چاہیے۔ اس مطالعے کے دوران جب جب پولیس فورس میں اقلیتوں کے لیے ریزرویشن کی بات اُٹھی، الگ الگ سطحوں کے پولیس افسران نے شدومد کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ پولیس میں بحالی ہونے کے تعلق سے اقلیتوں، خاص طور سے مسلمانوں میں عدم دلچسپی، تعلیم کی کمی اور پسماندگی جیسے کچھ اسباب ان حالات کے لیے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔ اس مطالعے کے دوران ان سارے اسباب کی گہرائی سے تفتیش نہیں کی گئی، کیونکہ ایسا کرنا مطالعے کے دائرے سے باہر تھا۔ ساتھ

ہی اکثر ملنے والی ان شکایتوں کی جانچ بھی نہیں کی گئی،جن کے مطابق بھرتی بورڈوں کے ذریعہ دیدہ ودانستہ یہ طے کیا جاتا ہے کہ ہر طرح سے لائق ہونے کے باوجود اقلیتوں کا انتخاب نہ ہوسکے۔ان معاملات پر الگ سے جانچ اور ریسرچ کی جانی چاہیے۔میں اس مطالعے کے دوران صرف پولیس میں اقلیتوں کی زیادہ نمائندگی کی سفارش کررہا ہوں۔یہ کام ریزرویشن کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے اور تنظیم میں کچھ بہتر طریقہ کار کو فروغ دے کر بھی۔

2- تربیت

پولیس میں تربیت کی اہمیت کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے۔ایسا صرف تربیت کے ذریعہ سے ہی ممکن ہوتا ہے کہ کچے مال کی طرح ملنے والا کوئی رنگروٹ (جوان) ایک پیشہ ور پولیس جوان کی شکل میں ڈھلتا ہے۔سنہ 1859ء میں ویلور (مدراس پریسڈنسی) میں سپاہیوں کے پہلے ٹریننگ اسکول نے ملک میں پولیس جوانوں کے لیے متحدہ اور منظم تربیتی دور کی شروعات کی تھی۔ گرچہ ہندوستان کی شہری خدمات میں پولیس وہ پہلی تنظیم تھی،جس نے ادارہ جاتی تربیت کی شروعات کی،لیکن بعد کے برسوں میں تربیت کی طرف سے غفلت اسی تنظیم کے ذریعہ برتی گئی۔پولیس میں تربیت کو نہ صرف دوئم درجہ ملا،بلکہ اس میں دی جانے والی تربیت اپنے وقت کی سچائیوں اور چیلنجوں سے آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔

تربیت کو پولیس تنظیموں میں کتنی اہمیت دی جاتی ہے،یہ اس حقیقت سے سمجھا جاسکتا ہے کہ زیادہ تر صوبائی پولیس فورس میں بنیادی تربیت کے بعد بیشتر پولیس عملے کو ریٹائرمنٹ سے پہلے کسی دیگر تربیتی پروگرام میں شامل نہیں کیا جاتا۔یہ بات بحالی کی تمام سطحوں جیسے سپاہی، سب انسپکٹر اور پولیس سپرنٹنڈنٹ، پر نافذ ہوتی ہے۔ایک سپاہی جو 18 سے 20 سال کی عمر میں پولیس فورس میں داخل ہوتا ہے،اپنی سروس کے اگلے 35 سے 40 سالوں میں کسی اور تربیتی پروگرام میں شریک نہیں ہوتا۔ہندوستانی پولیس کو درمیانی اور اعلیٰ سطح کی قیادت عطا کرنے والی ہندوستانی پولیس سروس (آئی پی ایس) کے افسران کے بارے میں سچائی بھی کم وبیش یہی ہے۔نیشنل پولیس اکادمی سے اپنی بنیادی تربیت حاصل کرنے کے بعد ان افسران کو بہت کم تربیتی پروگراموں سے گزرنا پڑتا ہے اور بہت سے افسران کے معاملے میں ایسا بھی ہے کہ انھوں

نے نیشنل پولیس اکادمی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد کسی بھی دوسرے تربیتی پروگرام میں حصہ نہیں لیا۔

منظم تربیتی پروگراموں کے ذریعہ نہ صرف مختلف سطحوں کے پولیس افسران کو پیشہ ورانہ طور سے اپنے فرض کی ادائیگی اور متعین مقاصد کے حصول میں مدد ملے گی' بلکہ اس سے ان کے ذہن کی دھند بھی صاف ہو گی جو دیگر مذاہب کے لوگوں کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں اور عصبیت پیدا کرتی ہے۔ پولیس تربیت کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے مقرر گورے کمیٹی نے زور دے کر کہا تھا کہ ''تمام جدید آلات اور تربیت کے باوجود اگر پولیس جوانوں کا دماغ' ذات پات 'مذہب اور علاقائیت جیسے تعصبات سے آزاد نہیں ہے تو وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔'' دراصل بنیادی تربیت اور بعد کے تربیتی پروگرام کا حقیقی مقصد یہی ہونا چاہئے کہ پولیس جوانوں کے دماغ تعصبات سے پاک ہوں۔

مناسب یہ ہو گا کہ ہر پانچ۔سات سال کے بعد اور ہر ترقی سے پہلے مختلف درجوں کے پولیس افسران کے لیے نئے تربیتی پروگرام بنائے جائیں۔ ان تربیتی پروگراموں کا خاص زور انسانی برتاؤ کے مطالعے پر ہونا چاہئے۔ انہیں اس طرح مرتب کیا جائے کہ ان کے ذریعہ سے ایک اوسط پولیس جوان کو دوسرے مذاہب کے متعلق مثبت فکر کو فروغ دینے میں مدد ملے۔ خاص طور سے بنائے گئے تربیتی پروگراموں کے ذریعہ ذات پات' علاقائی یا لسانی اختلافات کو صحیح طور پر سمجھنے میں اس کی مدد کی جانی چاہئے۔ تربیت کا خاص مقصد تربیت پانے والے کو یہ سمجھانا ہونا چاہئے کہ خاکی وردی پہننے کے بعد وہ ہندو یا مسلمان نہیں رہ جاتا' اس کا یقین صرف آئین اور ملک کے مختلف قوانین پر ہونا چاہئے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے یہ لازمی ہے کہ موجودہ تربیتی پروگراموں میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ میرا مشورہ ہے کہ اس طرح کے تربیتی پروگراموں کو مرتب کرنے کے لیے ماہرین عمرانیات' ماہرین نفسیات اور ماہرین علم نوع انسانی کی خدمات حاصل کی جانی چاہئے۔ انتہا پسندی کے خطرات' تحمل کی اہمیت اور سیکولرازم جیسے مضامین پولیس تربیت میں شریک کیے جا سکتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹنے کے پولیس کے تجربات اور خاص طور سے بعض فسادات میں پولیس کی ناکامی کے مفصل اسباب کی تفتیش کو بھی مختلف سطح کے پروگراموں میں شامل کیا جانا چاہئے۔ سبھی مذاہب کی تلخیص اور ان کی اچھی باتیں بھی پولیس جوانوں کو پڑھائی جانی چاہئیں۔ اس سے نہ صرف نووارد پولیس جوانوں کو مختلف

مذاہب کو سمجھنے میں مدد تو ملے گی بلکہ وہ اپنے آپ کو اس تعصب سے بھی آزاد کر سکیں گے جس میں پولیس میں داخل ہونے سے پہلے ہی سماج نے انہیں جکڑ ڈالا تھا۔ اعلیٰ پولیس افسران کے لیے ان اہم فسادات کا تفصیلی مطالعہ کرنا لازمی قرار دیا جانا چاہیے' جن میں پولیس کے طریقۂ کار کو مختلف عدالتی کمیشنوں' حقوقِ انسانی کی تنظیموں یا میڈیا کے ذریعہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان میں احمد آباد (1969ء)' بھیونڈی (1970ء)' بھاگلپور (1989ء) یا بابری مسجد کی مسماری (1992ء) جیسے تجربات خصوصی طور سے شامل کیے جانے چاہئیں۔ ذات پات اور نسلی فسادات سے نمٹنے میں برطانوی اور امریکی پولیس کے تجربات بھی اعلیٰ پولیس افسران کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ ایک ماڈل تربیتی پروگرام بنانا کافی وقت طلب اور دیرپا ہے' اس لیے اس مطالعے میں اس کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں الگ سے کوشش کی ضرورت ہے۔

3- ذمہ داری کا تعین :

گرچہ پولیس اور مجسٹریسی کے اعلیٰ افسران کی ذمہ داری کا تعین کرنے کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن حقیقت میں ہمیں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں' جب کسی فرقہ وارانہ فساد میں ناکامی کے لیے اعلیٰ افسران کو ذمہ دار قرار دے کر ان کو سزا دی گئی ہو۔ فساد روکنے میں ناکام ہونے پر زیادہ سے زیادہ کچھ نچلے عہدے کے افسران کو معطل کر دیا جاتا ہے' یہ سزا بھی اصل مجرموں کی شناخت کر کے انہیں سزا دینے سے زیادہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہوتی ہے۔ بیشتر معاملوں میں تنقید و جوابی تنقید ختم ہوتے ہی معطل افسر کو بحال کر دیا جاتا ہے۔ معطلی کو چونکہ سزا نہیں مانا جاتا' اس لیے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ زیادہ تر معاملوں میں مجرم افسروں کو کوئی سزا نہیں دی جاتی۔

فرقہ وارانہ پہلوؤں پر تشکیل شدہ کمیٹی کے ذریعہ تیار کردہ اور قومی یکجہتی کونسل کے 21/جون 1969ء کے اجلاس میں منظور شدہ تجاویز میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی بنائے رکھنے کے لیے اعلیٰ افسران کی ذمہ داریوں کا تعین بڑے واضح الفاظ میں یہاں کیا گیا ہے۔ اس کے کچھ مشورے اس طرح ہیں۔

1 - فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لیے موثر کارروائی نہ کر پانے پر ضلع مجسٹریٹ

اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو ذاتی طور پر ذمہ دار ٹھہرایا جانا چاہیے۔

2 - فوری اور موثر کارروائی میں ناکام ہونا' فرض کی ادائیگی میں ناکامی مانا جانا چاہیے اور متعلق افسروں کے خلاف اسی اعتبار سے کارروائی کی جانی چاہیے نیز ضرورت پڑنے پر ملازمت کی شرائط میں ترمیم کرنا چاہیے۔

3 - فرقہ وارانہ فساد کو روکنے یا ان سے مؤثر ڈھنگ سے نمٹنے کے سلسلے میں پولیس جوانوں کی حوصلہ افزائی کا طریقہ کار وضع کرنا چاہیے۔

قصور وار افسران کو سزا نہ مل پانے کی ایک وجہ تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ پیش کیے جانے میں تاخیر ہے۔ اکثر لمبے وقفے کے بعد پیش کی جانے والی ان کی رپورٹوں کو حکومتیں بغیر کسی کارروائی کے ہی دھول چاٹنے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں۔ ایک جانچ کمیشن اپنے کام کے لیے اوسطاً پانچ سے سات برسوں کا وقت لیتا ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں' جن میں خاص یہ ہیں: کمیشن کو ضروری سہولتیں فراہم کرنے میں حکومتوں کی بے توجہی' نوکر شاہی کے ذریعہ کمیشن کے ساتھ عدم تعاون' کمیشن کو وقت پر گواہ اور دستاویزات دستیاب نہ ہونا' وکیلوں کے ذریعہ کارروائی کو طول دینے کی کوشش اور ریٹائرڈ ججوں کی کمیشن کے رُکن کے طور پر حاصل شدہ مراعات سے تادیر فائدہ اُٹھانے کی خواہش۔ تاخیر کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں' لیکن اس سے قصوروار افسران کو سزا ملنے کی اُمیدیں زیادہ سے زیادہ معدوم ہوتی جاتی ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جانچ کمیشنوں پر لوگوں کا اعتماد آہستہ آہستہ کم ہوتا جارہا ہے۔ کسی فرقہ وارانہ فساد سے متعلق جانچ کمیشن کے تقرر کے اعلان کو' فسادات سے نمٹنے میں ہوئی ناکامی کی جانچ سے زیادہ قصوروار افسران کو بچانے اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔

ان معاملوں میں بھی جہاں قصورواروں کو سزا دی گئی ہے' یہ پایا گیا ہے کہ جرم کے تناسب میں سزا کی مقدار بہت کم تھی اور سزا اکثر نچلی سطح کے افسران کو ہی دی گئی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے دو مثالیں کافی ہوں گی۔ اس مطالعے کے دوران میں نے پایا کہ بھاگلپور (1989ء) لوگائیں گاؤں میں ایک ہی مقام پر 116 مسلمانوں کا وحشیانہ قتل کیا گیا اور ایک مہینے سے زیادہ عرصہ تک ضلع انتظامیہ ایسے کسی بھی واقعے سے لاعلمی کا اظہار کرتی رہی۔ اس سنگین کوتاہی کے لیے جس سب سے بڑے پولیس افسر کو سزا دی گئی وہ ایک اسسٹنٹ

سب انسپکٹر تھا۔ کسی بھی اعلیٰ افسر کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔ یہی حال میرٹھ 1987ء کے فسادات میں بھی ہوا۔ہاشم پورہ اور ملیانہ جیسے وحشیانہ واقعات کے بعد بھی کسی پولیس افسر کو سزا کا مستحق نہیں پایا گیا۔

4 - میرا مشورہ ہے کہ :

1 - قومی یکجہتی کونسل کی سفارشات کو ان کی اصل روح کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔

2 - ایسا قانونی نظم ہونا چاہئے کہ فساد کو روکنے میں لاپرواہی برتنے والے ضلع مجسٹریٹ اور ایس پی کو لازمی طور سے سزا مل سکے۔

3 - نوکرشاہی کو صحیح پیغام پہنچنے کے لیے یہ لازمی ہوگا کہ کسی جغرافیائی دائرہ کار میں فساد روکنے کے لیے مقرر کیے گئے افسران کو،ان کے علاقوں میں فساد بھڑکنے کی حالت میں 'فوراً معطل یا برخاست کردیا جائے۔ یہ افسران تھانہ انچارج سے لے کر ضلع مجسٹریٹ یا ایس پی تک ہو سکتے ہیں۔

4 - یہ بھی لازمی ہے کہ جانچ کمیشن ،صوبائی سی آئی ڈی یا سی بی آئی کو سونپی گئی جانچ ہر حال میں مقررہ وقت کے اندر مکمل کرلی جائے۔

5 - ان اداروں کی جانچ رپورٹیں سکریٹریٹ میں دھول چاٹنے کے لیے نہیں چھوڑی جانی چاہئے بلکہ ان پر ایمانداری سے کارروائی ہونی چاہئے۔

●●●

ضمیمہ 'الف'

فسادات زدگان کے لیے سوالنامہ

نام : ....

ولدیت : ....

مذہب : ....

عمر : ....

پیشہ : ....

تعلیم : ....

صحیح جواب پر نشان لگائیں :

1 - فرقہ وارانہ فسادات کے دوران آپ پولیس کو کس شکل میں پاتے ہیں؟

دوست ( )، دشمن ( )، غیر جانبدار ( )

2 - کیا آپ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس سے مدد مانگنے جائیں گے؟

ہاں ( )، نہیں ( )، کہہ نہیں سکتے ( )

3 - فرقہ وارانہ فساد کے دوران آپ اپنے علاقے میں کس فورس کی تعیناتی چاہیں گے؟

شہری پولیس ( )، پی اے سی ( )، سی آر پی ایف ( )، فوج ( )

4 - پولیس سے آپ فسادات کے دوران کیا توقع کریں گے؟

(الف) فسادیوں کے خلاف سختی اور سنگدلانہ کارروائی ( )

(ب) فسادیوں کے خلاف کسی تفریق کے بغیر سخت کارروائی ( )

(ج) ڈھل مُل کارروائی ( )

ضمیمہ 'ب'

پولیس افسران کے لیے سوالنامہ

نام : ....

عمر : ....

تعلیمی لیاقت : ....

عہدہ : ....

1 - فرقہ وارانہ تصادم کے دوران آپ پولیس کی غیر جانبداری کے تصور کو کس طرح ثابت کریں گے؟

2 - کیا آپ نے کبھی کسی فرقہ وارانہ فساد کے دوران پولیس جوانوں کے کسی برتاؤ میں کوئی فرقہ وارانہ تفریق دیکھی ہے؟

3 - کیا آپ پولیس لائن یا تھانوں میں مندر، مسجد، گردوارے یا گرجا گھر کی تعمیر درست سمجھتے ہیں؟

4 - کیا آپ کے خیال میں پولیس دفاتر میں مذہبی علامتوں کا استعمال مثلاً دیوی۔ دیوتاؤں کی تصاویر ٹانگنا یا پولیس سائن بورڈوں پر گیتا کے اشلوک لکھنا (جیسا کہ اتر پردیش پولیس کرتی ہے) یا پولیس تقریبات میں پوجا کرنے یا پھر پولیس کے روزمرہ معمولات میں ناریل توڑنے جیسی مذہبی علامتوں کا استعمال مناسب ہے؟

ضمیمہ 'ج'

اودھ کے چیف کمشنر کے سکریٹری 'جارج کوپر' کے ذریعہ یکم دسمبر 1857ء کو 'جے ایف ایڈمانسٹن' کو لکھا گیا ایک خط[1]

عزت مآب گورنر جنرل کو بتاریخ 14/ستمبر کو لکھے گئے چیف کمشنر کے خط کے سلسلے میں، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ مسلمان باغیوں کے خلاف بریلی کے ہندو عوام کو بھڑکانے کے لیے انھوں نے 50,000 روپے منظور کیے ہیں۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں کیپٹن گاون کے پچھلے ماہ کی 14/تاریخ کے خط کے کچھ حصے آپ کی خدمت میں ارسال کروں۔ جس سے عزت مآب اور ان کی کاؤنسل کو اندازہ ہو سکے گا کہ یہ کوشش پوری طرح ناکام رہی اور منظور شدہ رقم میں سے کوئی حصہ خرچ کیے بغیر ہی، اُسے ختم کر دیا گیا۔

کیپٹن گاون کے خط کی کاپی

میں یہاں کے ٹھاکروں کو کسی بھی تعداد میں جنگجو جمع کرنے کے لیے اکسانے میں پوری طرح ناکام رہا۔ مجھے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ وہ سرکار کو مؤثر تعاون دینے کو تیار ہیں، لیکن میں نے پایا کہ یہ تعاون صرف حال میں ان کی نیک خواہشات اور مستقبل کے لیے اس ڈینگ سے زیادہ نہیں ہے کہ اگر انھیں ایک مضبوط یوروپی فوج کی مدد ملے تو وہ کیا کیا کر سکتے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ یوروپی فوج ان کے بغیر، زیادہ بہتر کام کر سکتی ہے اور ان کی موجودگی تو ان کے سامنے رکاوٹیں ہی کھڑی کرے گی۔ نتیجتاً میں نے کوئی رقم خرچ نہیں کی اور کسی مقصد کے لیے سرکار کا کوئی چیک کیش نہیں کرایا۔

---

[1] ذریعہ یوپی اسٹیٹ آرکائیوز

○○



ڈاکٹر وبھوتی نارائن رائے 28 نومبر 1950ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم اتر پردیش کے بنارس اور الہ آباد شہروں میں ہوئی۔ 1971ء میں انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔ 1975ء میں انڈین پولیس سروسز (I.P.S.) کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پولیس ملازمت میں شامل ہو گئے۔ اس دوران انھیں اتر پردیش کے فرقہ وارانہ طور پر کئی حساس ضلعوں میں بطور ایس ایس پی تعیناتی ملی۔ ایک فرض شناس اور دیانت دار پولیس آفیسر کے طور پر انھوں نے اپنی علیحدہ شناخت قائم کی ہے۔ ایس وی پی نیشنل پولیس اکیڈمی حیدرآباد کے اوّلین پولیس فیلو کی حیثیت سے انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس کی غیر جانبداری کے موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے۔

پولیس ملازمت میں ہونے کے باوجود ڈاکٹر وبھوتی نارائن رائے نے اپنے ادبی ذوق کو بھی پروان چڑھایا اور ہندی ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ وہ گذشتہ 21 سال سے ہندی کے مشہور ادبی رسالے ''ورتمان ساہتیہ'' کے مدیر ہیں اور اب تک ان کی کئی تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے مشہور ناولوں میں ''گھر''، ''شہر میں کرفیو''، ''قصہ لوک تنتر'' اور ''تبادلہ'' کے علاوہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''ایک چھاتر نیتا کا روزنامچہ'' قابل ذکر ہیں۔

خبردار پبلی کیشنز
KHABARDAAR PUBLICATIONS
Z-103, Taj Enclave, Geeta Colony, Delhi-110031
Telefax : 011-2412891, E-mail : khabardaar1@mantraonline.com